تعلیم، امن اور ہم آہنگی

PAK INSTITUTE FOR PEACE STUDIES (PIPS)
www.pakpips.com

تعلیم، امن اور ہم آہنگی

مرتبین:

عاطف محمود

عابد سیال

پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز

اسلام آباد

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب: تعلیم، امن اور ہم آہنگی

مرتب: عاطف محمود، عابد سیال

اشاعت: جنوری 2018ء

تزئین: زی گرافکس

قیمت: 100روپے

تعداد: 2000

صفحات: 200

مطبع: بی پی ایچ پرنٹرز، لاہور

ISBN: 978-969-9370-28-1

تقسیم کار

Narratives

پوسٹ بکس نمبر2110، اسلام آباد

فون: 051-2806074

ای میل: info@narratives.pk

ویب سائٹ: narratives.pk

فہرست

پیش لفظ ..... محمد عامر رانا 5

پہلا مکالمہ 7

دوسرا مکالمہ 31

تیسرا مکالمہ 35

چوتھا مکالمہ 57

پانچواں اور چھٹا مکالمہ 69

ساتواں مکالمہ 91

آٹھواں مکالمہ 122

نواں مکالمہ 152

دسواں مکالمہ 172

پیش لفظ

یہ کتاب پاکستان کی جامعات اور کالجز کے اساتذہ کرام کے معروف ماہرینِ تعلیم، دانشوران، مذہبی، سماجی اور سیاسی امور کے ماہرین کے ساتھ مکالموں کی روداد پر مشتمل ہے۔ان مکالموں کا اہتمام پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز نے مارچ 2017ء سے ستمبر 2017ء کے درمیانی عرصے میں کیا۔ یہ مجالس اسلام آباد، کوہ مری، لاہور اور کراچی میں منعقد ہوئیں اور کوشش کی گئی کہ پاکستان کے نمایاں تعلیمی اداروں کی نمائندگی موجود ہو۔

یہ مکالمے اساتذہ کرام کے درمیان باہمی روابط بڑھانے کے ساتھ ساتھ ایک مثبت علمی تعلق کا سبب بھی بنے۔ان کی گفتگو اور آراء سے نہ صرف ان کے علمی اور فکری رجحان کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے بلکہ وہ سماجی بہتری کے عمل میں اپنا کردار ادا کرتے نظر آ رہے ہیں۔

ان مکالموں کا مقصد بھی اساتذہ کو مثبت مکالمے کی طرف لانا تھا تا کہ وطنِ عزیز کو جن فکری، سماجی، نظری اور تعلیمی مسائل کا سامنا ہے اس پر ان کی آراء سے نہ صرف ان مسائل کی نوعیت کو سمجھنے میں مدد ملے بلکہ وہ راہیں بھی روشن ہوں جن پر چل کر ہم اپنے سکولوں، کالجوں اور جامعات کو امن کے گہوارے، فکری نشوونما کی نرسریاں اور مفید شہری بنانے کے ادارے بنا سکیں۔

اس ضمن میں دو اہم مسائل کی نشاندہی ہوئی۔اوّل یہ کہ سماجی ہم آہنگی کے حصول کے لیے نصاب میں اصلاحات کی ضرورت ہے۔ دوم یہ کہ اساتذہ کرام کی ذہنی وسعت اور ان کی فکری تربیت پر بھی توجہ دی جائے تا کہ وہ طالب علموں کو محض جامد اشیا سمجھنے کی بجائے انھیں تنقیدی شعور سے آراستہ کریں۔

امید ہے یہ مکالمے بہتری کی امید کو زندہ رکھنے میں معاون ہوں گے۔ پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس اسٹڈیز اپنے تمام معلمین اور ماہرین کا شکریہ ادا کرتا ہے کہ انھوں نے اپنی فکر و دانش سے ان مکالموں کو توانا بنایا اور شرکا بطور خاص مبارک باد کے مستحق ہیں کہ وہ دور دراز علاقوں سے آ کر علمی تجزیے کے ان مکالموں میں شریک ہوئے۔ان مکالموں کے انعقاد میں محمد اسماعیل خان، نواف خان، شگفتہ حیات اور حسن سردار نے مرکزی کردار ادا کیا، جبکہ عاطف محمود اور عابد سیال ان مکالموں کی روداد سنوارنے اور کتابی صورت میں ڈھالنے پر خصوصی شکریے کے مستحق ہیں۔

محمد عامر رانا

13 دسمبر، 2017ء

سماجی ہم آہنگی اور مذہبی رواداری میں اساتذہ کا کردار

پہلی ایک روزہ تربیتی ورکشاپ

15 مئی 2017ء، لاہور

پہلی نشست

صدارت: قاضی جاوید

ڈائریکٹر، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور

مقررین:
- نصاب یا طریقۂ تدریس، غیر متوازن رویوں کا سبب کیا ہے؟

  مولانا عمار خان ناصر

  مذہبی سکالر، الشریعہ اکیڈمی، گوجرانوالہ
- استاد تبدیلی میں کیا کردار ادا کر سکتا ہے؟

  ڈاکٹر شہباز منج

  معلم، سرگودھا یونیورسٹی، سرگودھا
- نظامِ تعلیم اور سماجی ہم آہنگی میں حائل رکاوٹیں

  صاحبزادہ امانت رسول

  مذہبی سکالر، پرنسپل، ادارہ فکرِ جدید، لاہور

دوسری نشست

صدارت: صاحبزادہ امانت رسول

مذہبی سکالر، پرنسپل، ادارہ فکرِ جدید، لاہور

مقررین:
- انتہا پسندی کیسے پھیلتی ہے؟

  ڈاکٹر عامر عبداللہ

  سیکرٹری جنرل، المؤرد انسٹی ٹیوٹ، لاہور

- نظامِ تعلیم اور مذہبی اقلیتوں کی مشکلات

  حسین نقی

  سابقہ جوائنٹ ڈائریکٹر، ایچ آر سی پی، لاہور
- پاکستان میں تعلیمِ امن

  مجتبیٰ محمد راٹھور

  محقق، ادارہ امن و تعلیم، اسلام آباد

تیسری نشست

صدارت: ڈاکٹر عامر عبداللہ

سیکرٹری جنرل، المؤرد انسٹی ٹیوٹ، لاہور

مقررین:
- پاکستان میں تعلیمی پالیسی کیسے بنتی ہے؟

  مولانا عمار خان ناصر

  مذہبی سکالر، الشریعہ اکیڈمی، گوجرانوالہ
- پاکستان کا حالیہ فکری منظر نامہ

  قاضی جاوید

  ڈائریکٹر، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور
- پاکستانی سماج کو درپیش علمی اور فکری چیلنجز

  مولانا راغب حسین نعیمی

  مہتمم، جامعہ نعیمیہ، لاہور

پہلی نشست

15 مئی 2017ء کو پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز کی طرف سے سماجی ہم آہنگی اور مذہبی رواداری میں اساتذہ کے کردار پر ایک روزہ تربیتی ورکشاپ کا انعقاد کیا گیا جس میں جنوبی پنجاب کے 30 سے زائد اساتذہ کرام کو مدعو کیا گیا تھا۔ PIPS کی نمائندگی کرتے ہوئے استقبالیہ کلمات محمد عامر رانا نے پیش کیے۔ تقریب کی صدارت جناب قاضی جاوید نے کی۔

تعارف و پس منظر

محمد عامر رانا

یہ کوئی روایتی قسم کی مجلس نہیں ہے جس کا مقصد محض نشستاً برخواستاً ہو۔ اصل میں ہمارا مطمحِ نظر اس گفتگو کو ایسے پیرائے میں دوطرفہ بنانا ہے جس سے ہم پاکستان میں مکالمے کے کلچر کو فروغ دے سکیں۔ سب سے اہم یہ ہے کہ کیا ہماری رائے ہے حقائق پر مبنی ہے؟ ہمارے اردگرد جو روایتی قسم کا ماحول اور ادارے ہیں، اگر وہی ہماری ذہن سازی کر کے ہماری رائے کی تشکیل کرتے ہیں تو شاید ہم علمی کلچر یا تنقیدی شعور جو درسگاہوں میں درکار ہے، اس تک نہیں پہنچ سکیں گے۔

سماجی ہم آہنگی کو یہاں ہم نے بہت وسیع تناظر میں استعمال کیا ہے۔ ایک بات یہ کہ اس وقت قوموں کو جانچنے کے لیے، ان کی ترقی کی رفتار کو دیکھنے کے لیے دنیا میں چار عوامل اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک معاشی ترقی ہے، امن وامان کی صورت حال ہے، مستقبل گیری ہے، اور یہ کہ آپ کا معاشرہ کتنا ہم آہنگ ہے؟ ہم آہنگی سے مراد یہ نہیں ہے کہ سب ایک ہی طرح سے سوچنے لگیں اور ایک ہی طرح سے ان کی رائے بنے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ جو ان کے ہاں اختلافات ہیں، جو تنوع ہے، نہ صرف یہ کہ کوئی معاشرہ اسے برداشت کرتا ہے بلکہ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر اسے لطف و مسرت کا سامان کیسے بناتا ہے۔

کسی بھی ملک کے بارے میں مختلف اداروں کی طرف سے تخمینہ کاری اور درجہ بندی ہوتی

ہے۔ اس کے مختلف نشانات اور پیمانے ہوتے ہیں لیکن یہ چار عوامل بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ تو یہ بڑا اہم تناظر ہے اور یقیناً جو ہماری اندرونی صورت حال ہے اس کے لیے بھی اہم ہے کہ پاکستان مذہبی، نسلی اور لسانی طور پر ایک متنوع ملک ہے۔

قاضی جاوید

اس نشست میں ہمارے سامنے بنیادی سوالات یہ ہیں کہ کیا اساتذہ محسوس کرتے ہیں کہ معاشرے کو بدلنا چاہیے اور خرابیوں کا خاتمہ کرنا چاہیے؟ سائنس اور ٹیکنالوجی نے ہمیں لاتعداد سہولیات دے دی ہیں اس کے باوجود دنیا کی حالت پچھلے پچاس ساٹھ سال میں اچھی نہیں رہی۔ دنیا کے کئی حصوں میں انتہا پسندی بڑھی اور زندگی کا معیار بہتر نہیں ہو سکا، اس کی وجہ کیا ہے؟ دنیا مجموعی طور پر افلاس اور تشدد کا شکار ہے، اس معاملے میں سب سے اہم کردار تعلیم کا تھا لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ ہماری تعلیم صدیوں کے جنگوں اور نفرتوں کے ورثے کو سمونے کا ذریعہ بن گئی۔ ہم اساتذہ تعلیم کو کیسے بہتر کر سکتے ہیں؟

ہماری آج کی نشست کے پہلے مقرر عمار خان ناصر صاحب ہیں جو نصاب اور طریقہ تدریس کے موضوع پر بات کریں گے۔

نصاب یا طریقہ تدریس: غیر متوازن رویوں کا سبب کیا ہے؟

مولانا عمار خان ناصر

ہماری ورکشاپ کا بنیادی موضوع سماجی ہم آہنگی اور مذہبی رواداری میں اساتذہ کا کردار ہے، یہ دونوں چیزیں کم ہو رہی ہیں، اس کی ذمہ داری نصاب پر ہے یا اساتذہ پر؟ اساتذہ کی خامیاں بیان کر دینا تو بہت آسان ہے لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔ میرے نقطۂ نظر سے جب ہم استاد کی ذمہ داریوں کی بات کرتے ہیں تو ایک بہت اہم پہلو یہ ہے کہ ہم مذہبی اور تعلیمی روایت کو

معیار بنا کر موجودہ اساتذہ کی خامیاں بیان کرتے ہیں، اور اس چیز کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ جدید تعلیم کس اعتبار سے روایتی تعلیم سے مختلف ہے۔

بنیادی طور پر تعلیم کا محور استاد ہوتا ہے۔ ہماری روایت میں معاشرے میں استاد کے بننے کا عمل اخلاقی معیار پر مبنی تھا۔ جدید تعلیم میں، جس کا ہم حصہ ہیں، یہ تصور بالکل مختلف ہو گیا ہے، اس کی تنظیم ایک کارخانے کے اصول پر ہے۔ کیا ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اساتذہ کی تقرری میں سارے تقاضے پورے کیے جاتے ہیں؟ ہم تعلیمی اداروں اور ان میں سیاسی جماعتوں کے کردار سے واقف ہیں، ان تمام عوامل کو نظر انداز کر کے صورت حال کو دیکھنا زیادتی ہے۔ جیسا استاد ہم چاہتے ہیں، اسے تیار کرتے وقت ہم نے اسے ویسی صلاحیتوں سے لیس نہیں کیا۔ اس کی شخصیت میں توازن پیدا کرنے اور اسے عام افرادِ معاشرہ سے مختلف بنانے کا کوئی نظام موجود نہیں ہے۔ جو رویے ہمیں معاشرے میں ملتے ہیں وہ اساتذہ میں بھی ملیں گے، مثلاً ہم میں سے ہر دوسرا فرد غصے، مایوسی اور نفرت کا شکار ہے، اس کے خاتمے کے لیے موجودہ شخصیات میں سے کوئی تعمیری کردار تلاش کر کے لوگوں کو بتانا چاہیے۔ مثبت پہلو کی طرف ہماری توجہ ہی نہیں جاتی، اگر پچاس کام غلط ہو رہے ہیں تو دو ٹھیک بھی تو ہو رہے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ امید پیدا کریں۔

میں مثال دیا کرتا ہوں کہ ہمارے مشہور مذہبی دانشور نے دو تحریکوں کا موازنہ کیا کہ ایک نے اپنا سانچا بنایا کہ ہم نے دعوت دینی ہے اور وہ پوری امت کو ہی میدانِ دعوت سمجھتے ہیں، وہ ایک آدمی کے بدلنے سے ہی بہت امید پیدا کر لیتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں ایک دوسری تحریک نے اپنا ہدف اقتدار بنایا، اس میں جو فرد کسی دوسرے فرد سے ذرا مختلف ہے وہ اس کے لیے مسئلہ ہے، اس کی نفسیات احتجاجی بنے گی۔

اساتذہ کو ہمیں اس سماجی عمل میں شامل کرنا ہے، توقعات اسی قدر رکھیں جتنی ہم ان میں صلاحیت پیدا کر رہے ہیں۔ میں پُر امید ہوں کہ صحیح مقام سے بات کی جائے تو اساتذہ آمادہ ہوں گے۔

قاضی جاوید: بہت اہم گفتگو کی ہے عمار خان صاحب نے، اب ہمارے دوسرے مقرر ڈاکٹر شہباز منج صاحب سماجی تبدیلی میں استاد کے کردار پر بات کریں گے۔

استاد تبدیلی میں کیا کردار ادا کر سکتا ہے؟

ڈاکٹر شہباز منج

استاد تبدیلی کی کلید ہے، اور تعلیم پیغمبرانہ پیشہ ہے۔ اسلامیات کے اساتذہ کو کیا چیز سامنے رکھنی چاہیے؟ ہماری بطور استاد یا معلم ذمہ داری کیا ہے؟ اس میں مغالطہ مذہبی متون کی درست تعبیر کا ہے۔ جیسا کہ حدیث کا مفہوم ہے کہ تم میں سے جو کسی برائی کو ہوتا دیکھے تو اسے ہاتھ سے روکے، اس حدیث سے کیا مراد ہے؟ مذہبی متن کی تعبیر میں ہم ظاہر پرست ہو گئے ہیں۔ غور کرنا چاہیے کہ یہاں ہاتھ سے روکنے کا کیا مطلب ہے؟

سماجی اور مذہبی جذبات میں توازن پیدا کرنا بہت ضروری ہے کیونکہ ان دونوں معاملات میں آدمی بڑا حساس ہوتا ہے۔ رسول اللہؐ نے ان دونوں چیزوں پر خصوصی طور پر توجہ فرمائی۔ سورہ حجرات میں ایک واقعہ آتا ہے کہ آپؐ نے عقبہ بن معیط کو ایک قبیلے کے پاس زکوٰۃ لینے کے لیے بھیجا، انھوں نے وہاں جائے بغیر کہہ دیا کہ انھوں نے انکار کر دیا ہے جس پر تجویز دی گئی کہ اس قبیلے پر حملہ کر دینا چاہیے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا پہلے تحقیق کر لیں لیکن لوگ جذباتی تھے۔ آپ نے یہ طریقہ اپنایا کہ حضرت خالد بن ولیدؓ کی سربراہی میں ایک لشکر تیار کر کے بھیجا اور فرمایا کہ پہلے تحقیق کر لینا۔ انھوں نے جا کر مشاہدہ کیا تو بات برعکس نکلی، سردار نے کہا کہ ہم تو خود زکوٰۃ دینے کے لیے آ رہے تھے اور خوفزدہ تھے کہ کہیں رسول اللہؐ ہم سے ناراض نہ ہو گئے ہوں۔

قرآن یہ رویہ پیدا کرنا چاہتا ہے کہ ہوش پر جوش غالب نہیں آنا چاہیے۔ حضور نے ثقافتی جذبات کو بھی پیش نظر رکھا۔ ایک خوشی کے موقع پر بچیاں گیت گا رہی تھیں، حضرت ابوبکرؓ نے سمجھا کہ یہ اسلام کے نقطۂ نظر کے برعکس ہے اس لیے منع کیا لیکن آپؐ نے فرمایا کہ کرنے دو۔ اور صرف

معلومات فراہم کر دینا کافی نہیں، ان کا تجزیہ کرنا ضروری ہوتا ہے، **یتلو علیھم آیاتہ ویزکیھم۔**

مزید یہ کہ ہم مذہبی متون کی تعبیر کو موجودہ دور سے متعلق نہیں بناتے۔ ہم اکیسویں صدی میں ہیں، طلبہ کے سوالات کا جواب دینا چاہیے۔

فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا حصول کیسے ممکن ہے؟ تنوع ایک فطری امر ہے اسے قبول کرنا چاہیے۔ ایک طالب علم نے کہا کہ حق تو ایک ہی ہوتا ہے تو میں نے کہا کہ اس کا مطلب ہے باقی باطل ہیں تو یہیں سے فرقہ واریت شروع ہوتی ہے۔ ہمیں افکار، نقطۂ نظر اور تعبیر کے تنوع کو بطور خاص پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اور اساتذہ کہنے کی حد تک نہیں اپنے عمل سے اس حقیقت کو ثابت کریں۔ استاد پہلے خود فرقہ واریت کی سطح سے بلند ہو کر سوچے گا تبھی ایسا ممکن ہے۔

قاضی جاوید: ہمارا اگلا موضوع نظام تعلیم اور سماجی ہم آہنگی میں حائل رکاوٹیں ہے جس پر صاحبزادہ امانت رسول صاحب گفتگو کریں گے۔

نظام تعلیم اور سماجی ہم آہنگی میں حائل رکاوٹیں

صاحبزادہ امانت رسول

سماجی ہم آہنگی میں نظامِ تعلیم کے حوالے سے دو نظام ہمارے سامنے آتے ہیں جو دونوں تقسیم پر مبنی ہیں، مذہبی نظام فرقہ وارانہ تقسیم پر قائم ہے جبکہ سیکولر نظام طبقاتی تقسیم پر کھڑا ہے، اور دونوں ہی میں فرد کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ ان نظاموں میں فرد تعلیم کا محور نہیں ہے جبکہ حقیقت میں تعلیم و تربیت کی ضرورت ہی فرد کو ہے۔ اسی سے معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ PIPS کی ٹیم نے ایک سروے کے دوران لاہور میں مختلف لوگوں سے ملاقات کی تو خوفناک حد تک یہ بات سامنے آئی کہ لوگوں کا آپس میں میل جول نہیں ہے۔ انسان مل کر نہ بیٹھے تو رابطے کے فقدان کے باعث بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہمارے نظام کی طبقاتی تقسیم ہے جسے تعلیم نے ختم کرنا تھا۔ ہندو معاشرے میں جیسی ذات پات کی تقسیم ہے وہ یہاں بھی قائم ہوگئی ہے۔

فرقہ وارانہ تقسیم کو روکنے کے لیے بدقسمتی سے کوئی معتدل ادارہ قائم نہیں ہو سکا، جو قائم ہوا وہ چل نہیں سکا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ فرقہ وارانہ تقسیم کو ختم کیا جائے اور ہم اپنی تدریسی سرگرمیوں سے ان چیزوں کو نکالیں۔ سیکولر نظام تعلیم زیادہ خطرناک ثابت ہو رہا ہے۔ اس وقت ملک کا نظام تعلیم تین مختلف طبقات تیار کر رہا ہے: ایک طبقہ حکمرانی کے لیے، دوسرا ملازمت کے لیے اور تیسرا مزدوری کے لیے۔

سوالات و جوابات

سوال: ہم ساری ذمہ داری اساتذہ یا علماء پر ڈالتے ہیں، کیا کہیں حکومت بھی ذمہ دار ہے؟

جواب: یقیناً حکومت ذمہ دار ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہماری کوئی ذمہ داری نہیں بنتی، حکومت کا کردار بھی زیرِ بحث آئے گا لیکن ہمیں اپنی ذمہ داری بھی دیکھنی چاہیے۔

سوال: کیا یہ ضروری نہیں کہ فطری استاد کا انتخاب کیا جائے اور سوشل سائنسز پر توجہ دی جائے؟

جواب: یہ بات درست ہے، سائنس تشدد کی طرف لے کر جاتی ہے کیونکہ جو سائنس یہاں پڑھائی جاتی ہے وہ نامکمل ہے، اس کے ساتھ سائنس کا فلسفہ بھی پڑھایا جانا چاہیے۔ ہم مغرب کی پیروی کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مغرب نے سائنس کی بنیاد پر ترقی کی حالانکہ سائنس کی بنیاد بھی فلسفے پر ہے۔

سوالات، تجاویز و تبصرے

رائے: نصاب میں کوئی بڑی خرابی نہیں ہے۔ بڑے اداروں میں جو اسلامیات پڑھائی جا رہی ہے اس میں کتاب و سنت کی بجائے اختلافات پڑھائے جا رہے ہیں۔ اس سے بچے کے ذہن کو کس نہج پر ڈالا جا رہا ہے؟ جہاں تک الحاد یا فرقہ واریت کی بات ہے، اس پر سوچنا ہوگا۔ دینی

اداروں سے فارغ التحصیل طالب علموں کے لیے یونیورسٹی میں کوئی کورس ہو جس میں وہ دوسرے مسالک کے طالب علموں کے ساتھ بیٹھیں۔ نصاب کے حوالے سے مختلف اداروں کو حکومت نے اجازت دے دی ہے کہ وہ نصاب تیار کریں، بہت مختلف نصاب تیار ہو رہے ہیں۔

سوال: وہ اعتدال اور توازن کیا ہے جس پر ہمیں بات کرنا ہے۔ جب تک ہم کوئی معیار طے نہیں کریں گے کہ طلبہ کو یہاں تک لانا ہے ہم افراط و تفریط کا شکار رہیں گے۔ مزید یہ کہ ایک مسلم ریاست کے طور پر ہمارے لیے مثالیہ کیا ہے؟

تجویز: اس نوع کے سیمینار طالب علموں کی سطح پر بھی منعقد کیے جانے چاہییں۔

تجویز: یہ صرف اسلامیات کے استاد کی نہیں بلکہ تمام اساتذہ کی ذمہ داری ہے کہ مثبت سوچ پیدا کی جائے اور روزانہ کے لیکچر میں 'میسج آف دی ڈے' دیا جائے۔

تبصرہ: مذہبی اداروں کے مقابلے میں جامعات کو سیکولر ادارے کہنا مناسب نہیں لگتا۔ عدم رواداری اور فرقہ واریت کی ایک وجہ پرائیوٹائزیشن بھی ہے، کہ ایک شخص خود محنت کرتا ہے، پیسہ خرچ کرتا ہے مسجد و مدرسہ بناتا ہے تو وہ اپنے مسلک کی ہی بات کرے گا۔ جو لوگ معاشرے میں تبدیلی پر کام کر رہے ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ سیمینار سے مسئلہ حل ہو جائے گا، وہ براہِ راست عوام کو مخاطب نہیں کرتے۔

تبصرہ: نصاب اور طریقہ کار کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے، نصاب سے مراد میں کتاب نہیں لے رہا، اصل نصاب وہ ہوتا ہے جس میں ہر مضمون کا طریقِ تدریس بھی دیا جاتا ہے۔ سوال یہی ہے کہ متن کو متعلق کون بنائے گا؟

تبصرہ: ڈاکٹر اور وکیل کے لیے لائسنس یافتہ ہونا ضروری ہے لیکن استاد کے لیے کوئی استناد ضروری نہیں، ادارے تو ہیں لیکن تربیت نہیں، عمارتیں موجود ہیں لیکن ان کا کردار کچھ نہیں۔

تبصرہ: مذہبی شدت پسندی کے جتنے واقعات نظر آئے ہیں ان میں کہیں نہ کہیں حکومت کی کوتاہی نظر آئی ہے۔

تجویز: میٹرک کے بچوں کو جب ہم دو گروپوں میں تقسیم کر رہے ہیں تو تیسرا گروپ درس نظامی کے طلبہ کا ہونا چاہیے۔ اسی طرح ایف اے میں بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ جو علما سکولوں کالجوں میں ہیں وہ شدت پسندی سے دور ہیں، جن کو ہم آنے سے روک رہے ہیں وہ شدت پسندی کی طرف جا رہے ہیں۔

تجویز: سماجی ہم آہنگی میں مسجد، خاندان اور معاشرے کو بھی شامل کیا جانا چاہیے۔ والدین، میڈیا وغیرہ کے رویوں کی تبدیلی کے لیے بھی کوئی لائحہ عمل طے کرنا چاہیے۔

تبصرہ: سماجی علوم ہی سماجی ہم آہنگی کو پروان چڑھا سکتے ہیں لیکن انہیں بہت کم کر دیا گیا ہے۔ تخصص کا دور ہے، اس سے بھی تفریق پیدا ہوئی ہے کہ ایک طالب علم دوسرے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ طلبہ کی رہنمائی اس طور سے کی جاتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے دشمن بن کر نکلتے ہیں۔

تبصرہ: تاریخ کپڑے بدلنے کا نام نہیں ہے، کچھ چیزوں کی تفہیم میں مغالطہ ہے، تعلیم دینی یا دنیاوی نہیں ہوتی، ہوا اور خوشبو کا کیا مذہب ہوتا ہے؟ بچوں کو سکھانے کی نہیں، ان سے سیکھنے کی ضرورت ہے۔ تعلیم آپ کو معاشی حیوان بنا رہی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ استاد کو باوقار بنایا جائے، استاد اپنی عظمت کو سمجھے۔ ہم روایتی تقلیدی حل ڈھونڈ رہے ہیں، ہمیں تخلیقی ہونا چاہیے۔ قائداعظم سے پوچھا گیا آپ کا کون سا فرقہ ہے؟ کہا جو پیغمبرِ اسلامؐ اور خلفائے راشدینؓ کا تھا۔

تجویز: نصاب سازی میں متعلقہ لوگوں کو شامل نہیں کیا جا رہا۔ دورانِ تدریس کلاس میں سوال کا سیشن لازمی ہونا چاہیے۔

تبصرہ: تاریخ میں پرانی چیزیں ہی پڑھائی جا رہی ہیں، ہمارا نصاب وقت کے تقاضوں کے مطابق نہیں ہے۔

تجویز: اس طرح کی ورکشاپس چھوٹے شہروں میں بھی ہونی چاہییں۔ مدارس اور کالجوں میں موجود دوری کو ختم ہونا چاہیے۔

سوال: الحاد اور سیکولرازم میں فرق کیا ہے؟ کیا رواداری صرف مذہبی ہی ہوتی ہے یا اور کسی بنیاد

پر بھی ہوسکتی ہے؟

تجویز: پاکستان اسلام کے نام پر بنا لیکن سب طبقات کو سب کچھ مل رہا ہے سوائے دینی طبقے کے۔ ایف ایس سی لیول تک مدارس و سکول ایک ہی ہونے چاہییں، اس کے بعد تخصص ہو۔ جو صرف مدرسوں میں پڑھے ہیں ان کی باتوں میں تعصب ہے۔ مشترکہ نظامِ تعلیم کے بغیر یہ تعصب ختم نہیں ہوسکتا۔

تجویز: بہت سے مدارس کے پاس جدید علوم کی سہولت موجود نہیں ہے۔ اگر اکیڈمی میں ان کو جدید تعلیم بھی دی جائے تو وہ معاشرے میں بہتر کردار ادا کر سکتے ہیں، ان طلبہ کے لیے جدید علوم کا انتظام لازمی کرنا چاہیے۔

دوسری نشست

انتہا پسندی کیسے پھیلتی ہے؟

ڈاکٹر عامر عبداللہ

اس موضوع پر PIPS نے بہت کام کر رکھا ہے، میں نے بھی انھی کے کام سے استفادہ کیا ہے۔ پہلے آپ ان سلائیڈز میں کچھ بیانات ملاحظہ فرمائیں۔

پہلی سلائیڈ میں ایک کامیاب استاد کا بیان ہے، جو یوں ہے:

''ہمارے پاس ہزاروں طلبہ پڑھتے ہیں۔ ان میں سے کم از کم تین سو کے ساتھ ہمارا روز کا تعلق ہوتا ہے۔ ہماری ذمہ داری ہے کہ گروپ ڈائنامکس پر نظر رکھیں اور دیکھیں کہ تعلیم کے علاوہ ان کے رجحانات کیا ہیں۔ ان پر ہماری نظر ہوتی ہے۔ ہم کوشش کرتے ہیں کہ ان کی گرومنگ بہتر سے بہتر کریں اور ان کو معاشرے کا اچھا فرد بنانے کی کوشش کریں۔ اور پچھلے بیس سالوں سے ہم نے یہی کوشش کی ہے۔ اپنے طلبا کو بہتر پوزیشنز پر جاتے دیکھا ہے۔ ایسا نہیں کہ ان

کو کسی غلط ہاتھوں میں ہم نے جاتے دیکھا ہو۔ نہیں۔''

جبکہ دوسری سلائیڈ میں ایک ایسے والد کا بیان ملاحظہ فرمائیں جو ناکام ہوگیا۔

''میری اولاد سکول اور کالج میں میرے سامنے گئی۔ میں نے اس میں کبھی بھی انتہا پسندی کا رجحان نہیں دیکھا۔ ہمارا ایک نارمل خاندان ہے۔ ہمارے خاندان میں ایسے انتہا پسندی کے خیالات رکھنے والے کبھی نہ تھے۔ میرا خیال ہے ہم سے ہی کوئی کوتاہی ہوئی ہوگی کہ ہماری اولاد اس طرح انتہا پسندی کی طرف چلی گئی۔ ایسی کوئی چیز ہوتی تو مجھے یقین تھا کہ میری اولاد میرے ساتھ پہلے ڈسکس کرتی۔ لیکن اس نے اپنی یہ سوچ مجھ سے، اپنی ماں سے اور اپنی بہن سے چھپائی۔''

یہ دونوں ایک ہی شخص کے بیانات ہیں۔ ہم کچھ چیزوں پر بہت توجہ دے رہے ہوتے ہیں لیکن یہ نہیں جانتے کہ ہماری ناک کے نیچے کیا ہو رہا ہے۔

تیسری سلائیڈ میں انتہا پسندی کے پھیلاؤ کے مختلف ماڈلز ہیں، میں صرف پہلا ماڈل زیرِ بحث لاؤں گا کیونکہ یہ پاکستان کی موجودہ صورتحال میں زیادہ قابلِ عمل ہوسکتا ہے۔ ہمارے پاس اپنا کوئی ماڈل نہیں ہے۔ اس ماڈل کا نام "The Push and Pull Model" ہے۔

Push Factors میں ایسے عامل ہیں جو فرد پر ایک قسم کا دباؤ پیدا کرتے ہیں۔ ان میں سماجی ناہمواریاں اور نارسائیاں، حکومتی رِٹ اور اثر پذیری، ریاستی جبر اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں، ثقافتی خطرات، بے انتہا بدعنوانی اور مقتدر طبقوں کی لوٹ مار جیسے عوامل شامل ہیں جو فرد کو انتہا پسندی کی طرف دھکیلتے ہیں۔

Pull Factors میں ایسے عامل ہیں جو فرد کے لیے ترغیب کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان میں سیاسی، معاشی اور سماجی ناراضیوں کا ڈر، معاشی فوائد، نظریاتی کشش، ذاتی رجحانات وغیرہ شامل ہیں جو فرد کو انتہا پسندی کی طرف مائل کرتے ہیں۔

ان عوامل سے متاثر ہونے والے افراد کی بھرتی کا آن لائن انتظام موجود ہے۔ سوشل میڈیا پر 1600 اکاؤنٹس کا کئی ماہ تک جائزہ لینے کے بعد یہ رپورٹ تیار کی گئی۔

سوالات

سوال: کیا معاشی ناہمواریاں انتہا پسندی کا سبب نہیں بنتیں؟

جواب: اس بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا، ہمیں کچھ شواہد حق میں نظر آتے ہیں اور کچھ مخالفت میں بھی۔

سوال: انتہا پسندی کا تعلق صرف مذہب کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے۔ کیا واقعتاً مذہب کوئی کردار ادا کرتا ہے؟

جواب: مذہب اسلام میں ایسی کوئی بات نہیں لیکن مذہبی فکر میں بہت سی خرابیاں ہیں۔ ہمیں قومی ریاست کی ضرورت ہے لیکن ہمارا مذہبی فکر یہ کہتا ہے کہ ہمیں عالمی خلافت کی ضرورت ہے۔ اگر شدت پسند مسئلہ ہیں تو جو لوگ مقدس ہستیوں کے لیے توہین آمیز الفاظ استعمال کرتے ہیں وہ کیوں نہیں؟ ہم آدھی تصویر کیوں دیکھتے ہیں؟ اس وقت نوے فیصد بھرتیاں آن لائن ہو رہی ہیں۔ ریاست صرف اس پر قابو پانے کی کوشش کر سکتی ہے جو کچھ عوام میں موجود ہے۔ اگر کوئی بچہ تنہائی پسند ہوتا جا رہا ہے تو اس میں ریاست کچھ نہیں کر سکتی، والدین یا اساتذہ کا کردار اہم ہے۔ علما کی بھی ذمہ داری ہے کہ مسائل کے جوابات دیں۔ کیا آن لائن بھرتیوں کو روکنے کے لیے کوئی کام ہو رہا ہے؟ پی ٹی اے کام کر رہی ہے؟ ہم کیسے بچوں کے ذہنوں میں یہ بات پیدا کریں کہ اسلام یا داڑھی انتہا پسندی کے مسئلے کے ذمہ دار نہیں؟ غلط تشریحات پڑھائی جا رہی ہیں۔ ہم سب کی ذمہ داری ہے کہ بچوں کے سوالات کے جواب دیں۔ علما اپنا کردار ادا کریں۔

امانت رسول: سیکولر ایجوکیشن سے مراد مذہب مخالف تعلیم نہیں بلکہ ان شعبوں کی تعلیم ہے جو مذہب سے براہِ راست متعلق نہیں ہیں۔ اب حسین نقی صاحب گفتگو کریں گے۔

نظام تعلیم اور مذہبی اقلیتوں کی مشکلات

حسین نقی

میں نے پاکستان بنتے اور پھر ٹوٹتے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ہمیں یہ بتایا گیا تھا کہ پاکستان اس مسلم اقلیت کے لیے بن رہا ہے جو دو خطوں میں اکثریت میں ہیں۔ یہ اقلیتوں کے حقوق کی تحریک تھی۔ اساتذہ کا رجحان مذہبی فکر کا تو ہے لیکن دینی نہیں۔ نظام کا مطلب ہے مختلف جزئیات کا مجموعہ۔ تعلیم کا بنیادی مقصد یہ ہے آپ اس کے ذریعہ نصب العین طے کر سکتے ہیں۔ ذہنی کشادگی بھی ایک مقصد ہے لیکن معاملہ اس کے برعکس ہے۔ دیگر مقاصد میں شعور میں اضافہ، اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا فن اور انسان دوستی کا مظاہرہ وغیرہ شامل ہیں۔

اب اس حوالے سے اقلیتوں کی مشکلات کا اندازہ لگائیں کہ کب سے اسلامیات کو شامل کیا گیا؟ اور اقلیتوں کے لیے کیا شامل کیا گیا؟ کوئٹہ کے سوائے تین سکولوں کے کہیں بھی اخلاقیات نہیں پڑھائی جاتی۔ عمر کوٹ ایک ایسا ضلع ہے جس میں سخت گیر مسلم اقلیت میں ہیں، اس میں بھی ہندو بچوں کو اسلامیات پڑھائی جاتی ہے۔

مذہبی اقلیتوں پر اکثریتی جبر اس قدر نافذ کیا گیا کہ ہندو بچوں کو نماز سکھائی جاتی ہے۔ نصاب میں آپ کو ملے گا کہ شاید دیوبند اور ندوہ کا تحریک پاکستان میں حصہ تھا حالانکہ دونوں کا نہیں تھا۔ سندھ مدرسہ بنانے میں سندھی ہندوؤں کا کردار تھا۔ اب پنجاب میں ناظرہ بھی شامل نصاب کر دیا گیا ہے۔

کیا آپ نے رفعت فرخ کا نام سنا ہے؟ یہ ہندوستان سے تعلق رکھنے والا مسلمان بچہ ہے جس نے سیٹلائٹ تیار کیا ہے۔ پاکستان میں ایسا کیوں نہیں ہوا؟ یہاں سارا زور ہمیں مسلمان کرنے میں لگتا ہے، چودہ سو سال میں ہم مسلمان نہیں بن سکے۔ چودہ سو سال پہلے ہمیں حضورؐ سے اتنی محبت نہیں تھی جتنی آج ہے کہ توہین کرنے والے کو قتل کریں۔

اخلاقیات کی کتاب تیار کرنے والی ٹیم میں بھی کوئی غیر مسلم نہیں ہے۔ اساتذہ ان کے سامنے ان کے مذہب کی تضحیک کرتے ہیں۔ اگر وہ اپنے مذاہب پر تحقیق کرنا چاہیں تو کتنی

لائبریریاں ہیں؟

سوالات وتبصرے

تبصرہ: میں نے اخلاقیات کی کتاب پڑھائی اس کی تدوین میں ایک پارسی کا نام موجود ہے۔

تبصرہ: جب پاکستان بنا تو 1946 میں ایک امریکی جنرل نے کہا تھا کہ مذہبی اور انتہاپسند جماعتیں ہمارا اثاثہ ہیں۔

سوال: 90ء تک ہمیں کوئی شدت پسندی نظر نہیں آتی، پھر اچانک کیا ہوا؟ یہاں کوئی جنگ مذہب کے نام پر نہیں ہوئی، یہاں کے لوگوں نے ہر قسم کے مذہب کو قبول کیا ہے۔

تبصرہ: انتہاپسندی کا ایک عامل نظام تعلیم بھی ہے۔ جابرانہ طرز حکومت اور فوجی اقتدار سے جو ماحول پیدا ہوا وہ بھی ذمہ دار ہے۔

تبصرہ: معاشی اور سیاسی انتہا پسندی غالب ہے۔ مسئلہ انسانوں کی اقلیت کا ہے نہ کہ مذہبی اقلیت کا۔

سوال: جو اسلامیات پڑھائی جاتی ہے وہ شیعیت کی تکذیب ہے، تو شیعہ مسلک سے تعلق رکھنے والا کوئی طالب علم کیسے اسلامیات میں پی ایچ ڈی کرے؟

پاکستان میں تعلیمِ امن

مجتبیٰ محمد راٹھور

میری گفتگو کے تین حصے ہوں گے۔ آپ سے بھی رائے جانوں گا تاکہ موضوع کو سمجھنے میں آسانی ہو سکے۔ پیشِ نظر سوالات یہ ہیں کہ امن کی تعلیم کیا ہے؟ اور بہترین رول ماڈل کیا ہے؟

امن کس کو کہتے ہیں؟ امن کی کوئی نصابی تعریف نہیں ہے۔ جب موجودہ دور میں ہم امن کی بات کرتے ہیں تو اس سے مراد کسی تنازعہ یا جنگ کا نہ ہونا ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں: ایک مثبت امن، جہاں شدت پسندی نہ ہو اور دوسری منفی امن۔

پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ تعلیم امن سے کیا مراد ہے؟ اس سے مراد ہے پاکستان میں تنازعات اور ان کے اسباب سے آگاہی۔ جیسے لسانی اور صوبائی تنازعات اور فرقہ واریت۔ جب مسلمات پر تیشہ رکھا جاتا ہے تو تنازعہ پیدا ہوتا ہے۔ دہشتگردی جنم لیتی ہے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ ان کے حل کے لیے بطور سول سوسائٹی اور استاد آپ کیا کردار ادا کر سکتے ہیں؟

مذہبی فکر کے ذریعہ جو تنازعات پیدا ہوتے ہیں ان پر علما بھی اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ ہماری اس پر علما سے مشاورت ہوئی اور یہ بات سامنے آئی کہ نصاب تیار کیا جائے۔ اس سلسلے میں ہم اتحاد تنظیمات مدارس کی قیادت کو مصر اور ترکی لے کر گئے، ان کے نصاب کا جائزہ لیا گیا اور پاکستان آ کر نصاب کی تیاری کا کام شروع کر دیا جو علما کی نگرانی میں ہوا۔ 2014 سے یہ نصاب مختلف مدارس میں پڑھایا جا رہا ہے اور 2000 مدارس میں یہ نصاب پڑھایا جا چکا ہے۔ اس سارے عمل میں دینی مدارس کے قائدین کا بڑا مثبت کردار رہا۔

نصاب کی اس کتاب کی ضرورت واہمیت کے تین پہلو ہیں ایک تعلیمی، دوسرا معاشرتی اور تیسرا دینی۔ تعلیمی حوالے سے جید علمائے کرام، اساتذہ کرام اور دانشوروں کی نظر میں یہ کتاب طلبہ کی ذہنی، نفسیاتی اور اخلاقی طور پر متوازن تعمیر اور شخصیت کے لیے مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ دینی مدارس کے اساتذہ، مبلغین اور خطباء کے لیے منعقدہ تربیتی ورکشاپس کے دوران اس کتاب کا مطالعہ کروایا جاتا ہے اور اس کے پڑھانے کے لیے تربیت فراہم کی جاتی ہے۔ تربیتی ورکشاپ کے اس مرحلے سے گزرنے والے اساتذہ نے اس کتاب کو دینی مدارس، سکول، کالج اور یونیورسٹی کے تمام طلبہ کو پڑھانے پر بہت زور دیا ہے۔ تعلیمی نصاب میں فروغِ امن اور حلِ تنازعات کی شمولیت سے اس موضوع پر طلبہ کی استعدادِ کار میں اضافہ ہونے اور کردار سازی میں مدد ملنے کے ساتھ ساتھ اس شعبے میں مزید تحقیق اور مطالعے کی نئی راہیں کھل سکتی ہیں۔

معاشرتی حوالے سے دیکھا جائے تو چونکہ اس کتاب میں امن کے فروغ اور تنازعات کے حل کے لیے بہترین تجاویز، اصول واقدار اور اسالیب بیان کیے گئے ہیں، اس لیے فروغ امن اور

حلِ تنازعات کے اعتبار سے طلبہ کی استعدادِ کار میں اضافے کے ذریعے مستقبل میں معاشرے سے تشدد، بدامنی، امتیازی سلوک، سماجی ناانصافی اور مختلف النوع تنازعات اور ان کا باعث بننے والے تصورات میں کمی لائی جاسکتی ہے۔

دینی حوالے سے دیکھیں تو یہ حقیقت واضح ہوچکی ہے کہ امن کے فروغ اور تنازعات کے حل میں مذہب کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ امن و رحمت کے دین ''اسلام'' کی امن، رواداری اور انسانیت سے بھلائی کی گراں قدر تعلیمات کا فروغ ہمارا دینی فریضہ اور عین عبادت ہے۔ نیز اس وقت فروغِ امن اور حلِ تنازعات کے اسلامی نمونے کا بین الاقوامی سطح پر مطالعہ کیا جارہا ہے۔ معاشرے میں فروغِ امن اور حلِ تنازعات کے ضمن میں دینی مدارس اور دینی قائدین کے مؤثر، وسیع اور قائدانہ کردار کے پیشِ نظر جید علمائے کرام کی طرف سے اس نصاب کو سب سے پہلے دینی مدارس کے نصاب میں شامل کرنے کی تجویز دی گئی ہے۔

سوال: ہمارے بچوں کا کیا قصور ہے کہ پہلے انہیں جہاد کی تعلیم دی گئی اور اب امن کی تعلیم دی جارہی ہے؟

جواب: جہاد کی تعلیم دینے والوں نے اپنا کام کیا، ہم اپنی ذمہ داری پوری کررہے ہیں۔

تیسری نشست

پاکستان میں تعلیمی پالیسی کیسے بنتی ہے؟

مولانا عمار خان ناصر

یہ سوال مختلف طریقوں سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ پاکستان میں پالیسی کیسے بنتی ہے؟ اس پر عمل کیوں نہیں ہو پاتا؟ اور اس حوالے سے حکومت سے ہماری توقعات کیا ہوسکتی ہیں؟

تعلیم کے حوالے سے سات پالیسیاں بنائی گئی ہیں اور کچھ منصوبے ہیں۔ ریاست سے ہم تعلیم کے شعبے میں کچھ توقعات وابستہ کرتے ہیں، پھر اس کی کارکردگی کا جائزہ لیتے ہیں اور پھر تنقید

کرتے ہیں تو اس ضمن میں ہماری سول سوسائٹی میں حکومتوں کی کارکردگی جانچنے کے لیے جو ذہنیت ہے اس کو ہم زیرِ بحث لائیں گے۔

اس کے متوازی ایک اور بات بھی کروں گا۔ آج ہم نے مذہبی فکر کے اثرات پر بھی بات کی۔ آج کا مذہبی فکر یہ ہے کہ مسلمانوں کے دنیا میں مقتدر قوت ہونے کی جو حیثیت اب ختم ہوچکی ہے، اسے کیسے بحال کیا جائے؟ یہ خواب صرف ان عناصر کا نہیں ہے جن کو ہم انتہا پسند کہتے ہیں، بیسویں صدی کی سب تحریکوں کا مشترکہ خواب یہی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ فرق کہاں سے پڑتا ہے؟ نظریہ ایک ہی ہے لیکن کچھ عناصر جدید مسلمان ریاستوں سے متعلق ایک غلط فہمی کا شکار ہیں کہ جمہوری ریاستیں جن کے ساتھ ہم نے اسلام کا سابقہ لگا کر اسلامی جمہوری بنا دیا ہے انہیں اسلام کے غلبے کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔

برصغیر میں یہ سوچ ڈاکٹر حمید اللہؒ اور مولانا مودودیؒ جیسی شخصیات کی طرف سے بڑی وسعت کے ساتھ آئی۔ یہ فرض کرلیا گیا کہ ہم سیاسی طور پر آزاد ریاست ہیں اس لیے اسے کچھ نظام بنا دینے کی ضرورت ہے۔ یہ تصور غلط ہے۔ جمہوری ریاست وہ نہیں ہے جسے ہم دائرہ اسلام کہہ سکتے ہیں۔ یہ وہ ریاست نہیں بن سکتی جس کا مسلمان خواب دیکھ رہے ہیں۔ اس میں معاملہ بہت مختلف ہے۔ اس سے ایسی توقعات وابستہ کرنا کہ یہ وہ سب کچھ کرسکتی ہے جو کرنا چاہیے اور کیوں نہیں کررہی بلکہ رکاوٹیں ڈال رہی ہے، اس سے انتہا پسندی پیدا ہوئی۔ یہ غلط فہمی ہے۔

اسی طرح ہم غیر حقیقی طور پر اساتذہ سے بھی توقعات وابستہ کرلیتے ہیں۔ میں یہ دیکھتا ہوں کہ مذہبی فکر میں کیسے یہ چیز آئی ہے۔ میرے خیال میں سول سوسائٹی بھی جب ریاست کو تجاویز دیتی ہے تو اسی بنیاد پر دیتی ہے۔ سماج کے نقطۂ نظر سے یہ بات اس طرح سے نہیں ہوسکتی جیسے میڈیا پر ہورہی ہے۔ اس وقت سب سے بڑی سمجھنے کی چیز یہی ہے کہ معاملات اتنے سادہ نہیں ہیں جتنے فرض کرلیے گئے ہیں۔ وہ طاقت ہی ریاست کے پاس نہیں ہے۔ مسائل سماج میں ہیں اور ہم توقع کرتے ہیں کہ ریاست پالیسیاں بنائے گی۔ آج فرض کرلیں کہ ریاست اس کی قائل ہوجائے کہ

مذہبی تعلیم کا یہ نظام تفریق پیدا کر رہا ہے اور ہمارے نوجوان کو معاشرے سے کاٹ دیتا ہے اور یہ فرقہ واریت پر مبنی ہے، اگر ریاست میں یہ عزم پیدا ہو بھی جائے تو کیا وہ اپنی طاقت سے اس کو حل کر سکتی ہے؟ کبھی نہیں۔

طبقاتی تعلیم کا مسئلہ بھی یہی ہے کہ وہ سارے طبقات خود ریاست کا حصہ ہیں، یہ ان کے اپنے مفاد کے ہی خلاف ہے۔ یہ ایسا ملک ہے جس میں معاشرہ ریاست سے زیادہ طاقت ور ہے حالانکہ ریاست معاشرے کی سمت نمائی کیا کرتی ہے۔ تاہم ہم تجزیہ ضرور کر سکتے ہیں، مثالی صورت حال زیر بحث لائی جا سکتی ہے۔

یہ سمجھنے کی بجائے کہ جس ریاست سے ہم توقع وابستہ کر رہے ہیں وہ یہ کام کر ہی نہیں سکتی، اس پر تنقید کر رہے ہیں۔ یہ اعتماد ختم ہونے کے نتیجے پر ایسا ہو رہا ہے، بات صرف مذہبی طبقے کی نہیں ہو رہی پورا معاشرہ ہی مایوسی اور قنوطیت کا شکار ہے۔ حالات بہت پیچیدہ ہیں۔ یہ کام راتوں رات ہونے والا نہیں۔ ہم حکومت کو ذمہ دار ٹھہرا کر بری الذمہ نہیں ہو سکتے۔ ریاست کو صرف لتاڑتے جانا اپنی ذمہ داری سے نظریں چرانے کے مترادف ہے۔

سوالات و تبصرے

تبصرہ: پورے کلچر میں تبدیلی رفتہ رفتہ آئے گی، ہمیں کام شروع کر دینا چاہیے۔ سچ بولنا چاہیے، حکومت جو کام نہیں کر سکتی اسے کہہ دینا چاہیے کہ ہم نہیں کر سکتے۔

سوال: میرے خیال میں سول سوسائٹی مڈل کلاس کو کہتے ہیں۔ اب اس درمیانے طبقے کے لوگ ختم ہو رہے ہیں، یا غریب ہیں یا امیر۔ آپ کیا کہتے ہیں؟

تبصرہ: ایک طبقہ ہمیشہ موجود رہتا ہے جو چیزوں کو تنقیدی طور پر دیکھتا ہے۔ ہماری تربیت ہی اسی طرح ہوئی ہے کہ ہم ہر چیز کو سیاسی نقطہ نظر سے دیکھیں۔ ہم سماج کو سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے۔

سوال: یہ بات درست ہے کہ ریاست سے زیادہ توقعات وابستہ نہیں کرنی چاہییں، لیکن کسی

بھی معاشرے کا اچھا پہلو یہ ہے کہ وہ آئیڈیل کو تلاش کرے اور متحرک رہے۔ کرنا کیا ہے؟ کس طریقے سے کرنا ہے؟ ہماری رہنمائی کریں۔

جواب: میرا اس پر ایک نقطۂ نظر ہے، حکومت اور اقتدار کے حصول اور دائرے کا کیا ایک ہی ماڈل ہے؟ میرا فہم دین یہ کہتا ہے کہ ہمیں اس کے لیے انبیا کی پوری روایت کو سامنے رکھنا چاہیے کہ کون سا ماڈل ہمارے لیے زیادہ موافق ہے۔ ہوسکتا ہے حضرت یوسفؑ کا ماڈل ہمارے لیے زیادہ قابلِ تقلید ہو۔

پاکستان کا حالیہ فکری منظر نامہ

قاضی جاوید

جب پاکستان وجود میں آیا تھا تو پاکستان کے معاشرے کو بہت آسانی سے کہہ سکتے تھے کہ یہ روشن خیال معاشرہ تھا۔ 14 اگست 1947ء کو جب ہر طرف آگ لگی ہوئی تھی، لاہور کے اس ہال میں معمول کے مطابق رقص چل رہا تھا۔ جب میں پنجاب یونیورسٹی میں طالب علم تھا تو ایک کرنل صاحب بات کرتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ تم بہت بدقسمت زمانے میں پیدا ہوئے ہو، مال روڈ پر گیارہ جگہوں میں رقص ہوتے تھے۔ یکجہتی کا احساس رقص کے بغیر ممکن نہیں۔

اس زمانے میں جب یہ نسبتاً کشادہ معاشرہ تھا، فلسفے کے اساتذہ نے ایک انجمن بنا رکھی تھی جس کے اجلاس ہر سال باقاعدگی سے ہوتے تھے۔ وہ وسائل کی کمی کا زمانہ تھا لیکن ان میں دنیا کے نامور فلسفی مصر، ایران وغیرہ سے آیا کرتے تھے۔ اس زمانے کے جتنے بھی ثقافتی تنازعات تھے ان پر بحث مباحثے ہوتے اور شائع ہوتے۔ ادبی سرگرمیاں بھی جاری تھیں، فیض، احمد ندیم قاسمی جیسے لوگ موجود تھے۔

اٹک ایک چھوٹا سا قصبہ ہے، اس ایک ٹاؤن میں ایسے لوگ موجود تھے۔ مذہب میں بھی ایسے لوگ تھے، مولانا مودودی، پرویز صاحب، اور ان کے مخالفین بھی کام کر رہے تھے۔ شاکر علی اور چغتائی صاحب کے علاوہ ایسے پینٹرز تھے جو پاکستان سے باہر بھی مشہور تھے۔ لیکن ساٹھ کی

دہائی کے بعد، جب ہم کالج میں تھے تو ناممکن تھا کہ کوئی استاد یا طالب علم شلوار قمیض پہن کر آتا ہو، کرکٹ میچ ہوتا، کمنٹری انگریزی زبان میں ہوتی تھی تو میٹرک کا طالب علم بورڈ پر لکھتا تھا کہ اتنے رنز ہو گئے۔ لاہور کی حالت یہ تھی کہ یہاں ہفتے کے سات دنوں میں آٹھ میلے ہوتے تھے۔

یہ روشن خیال معاشرہ تھا لیکن ستر کی دہائی کے بعد ردِعمل شروع ہوا۔ 1965 میں پروفیسر حمید احمد خان پرنسپل مقرر ہوئے۔ وہ ان لوگوں میں تھے جنہوں نے تحریک شروع کی تھی کہ پاکستانی جامعات میں وسیلہ تعلیم اردو زبان ہونا چاہیے۔ یہ کھلی فضا سے تنگ فضا میں جانے کی طرف پہلا قدم تھا۔ یہ ثقافت کی یا علم کی زبان نہیں تھی، وہ ہندی زبان تھی، انگریزوں نے بعض کتابوں کے ترجمے کروائے، ان میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی، ہندوؤں نے سنسکرتی رسم الخط اختیار کیا اور مسلمانوں نے عربی۔ 1872ء میں پہلی مرتبہ اردو کا لفظ استعمال ہوا۔ اردو زبان نے ہم لوگوں کی پنجابی زبان کو ختم کر دیا۔ اردو کا کوئی ورثہ نہیں تھا۔ غالب کے بارے میں لکھا ہوتا ہے کہ وہ ہندی زبان کے شاعر تھے۔ پنجابی میں ایک ہزار سال کی تاریخ ہے۔ صوفیا کی یہ بات ملے گی کہ نہ میں ہندو ہوں نہ مسلمان، میں اچھے انسان کے طور پر زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔

پنجابی زبان کی تاریخ ایک ہزار سال پرانی ہے، جس میں درویشوں نے، ہندوؤں نے اور سکھوں نے حصہ لیا۔ ایک ہزار سال کی صوفیانہ زبان کو گالیوں کی زبان کہا جانے لگا۔ نائن الیون کے واقعہ نے ہمارے ہاں انتہا پسندی کو تقویت دینے میں حصہ ڈالا۔ اس سے پہلے سوویت یونین تھا وہ ختم ہو گیا لیکن ایک دشمن موجود ہے جو زیادہ وحشی اور خطرناک ہے۔ ان کی اپنی ضرورت تھی، اور انھوں نے اسلام کو احمقانہ طور پر اپنا دشمن قرار دیا۔

پاکستانی سماج کو درپیش علمی اور فکری چیلنجز

مولانا راغب حسین نعیمی

آج کی نشست میں میرے مخاطبین میں ہر شعبے کے اساتذہ موجود ہیں۔ میں اس اعتبار سے

اپنی معروضات پیش کروں گا کہ ہم سماج کو کیسا دیکھیں؟ **انما بعثت معلما** کو اگر سامنے رکھیں اور آپ کی سیرت طیبہ کا یہ پہلو سامنے رکھیں کہ آپ نے صرف دین سے متعلق پوچھے جانے والے سوالات کے جوابات نہیں دیے بلکہ جس موضوع سے متعلق پوچھا گیا، آپ نے جواب دیا۔

ہمارے طلبہ مختلف سوچ اور پس منظر کے حامل ہوتے ہیں۔ ہمیں دیکھنا ہے کہ ان تبدیلیوں کو ہم کیسے سمجھیں۔ اس وقت ہمارے سامنے ایک بڑا فکری چیلنج یہ ہے کہ دہشت گردی کو اسلام کے ساتھ جوڑا جا رہا ہے۔ نائن الیون کے بعد ہم بھی بڑی بری طرح اس کا شکار ہوئے، ابھی تک ہماری ریاست جوابی بیانیے کی تلاش میں ہے۔ بچوں کی تربیت کے عمل میں کمزوری میں والدین اور بچوں کے مابین پیدا ہونے والی دوری اور سوشل میڈیا بڑی وجہ ہے۔ اس تناظر میں ہمیں اس چیلنج سے عہدہ برآ ہونا ہے جس کے نتیجے میں میڈیکل کی طالبہ دہشت گردوں کے ہتھے چڑھ گئی۔ اسی طرح تعلیمی اور تدریسی منصوبہ بندی کا بھی بہت بڑا کردار ہے کہ چالیس منٹ کی کلاس میں بچوں کو نصاب پورا کرانا ہے، گویا ہم نے بچوں کو محض نمبر حاصل کرنے کی دوڑ میں لگا دیا ہے۔ اس کے علاوہ سیاستدانوں کے گذشتہ سات آٹھ برسوں کے بیاناتی پیرائے نے نوجوانوں کو منہ پھٹ بنا دیا ہے۔

دوسری طرف یہ سوال ہے کہ جو اختلافات صدیوں سے چلے آ رہے ہیں کیا وہ ایک ساتھ رہ سکتے ہیں؟ مختلف طبقات اور مکتبہ ہائے فکر جو مذہبی حوالے سے وجود میں آ گئے ہیں ان کو ہم الگ الگ کر کے معاشرے کو خانوں میں نہیں بانٹ سکتے۔ ایک ہی حل ہے کہ ایک دوسرے کے نظریات کو تسلیم کرتے ہوئے بقائے باہمی کی کوئی صورت پیدا کی جائے۔

ایک چیلنج میڈیا کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ میڈیا کی بڑھتی ہوئی اثر پذیری نے ہمارے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت پر بھی اثر ڈالا ہے۔ قانون کی پاسداری ہونی چاہیے۔ لیکن جب ناموس رسالت کے معاملے پر کوئی قتل کرتا ہے تو کہتے ہیں اس نے قانون ہاتھ میں لیا، لیکن اگر کسی لڑکی پر آوازیں کسنے کی وجہ سے یا چوری کرنے والے کی عوام نے پٹائی کر دی تو خبر

لگتی ہے کہ چھتر ول ہو گیا۔ حالانکہ ردِعمل کی یہ دونوں صورتیں ایک ہی معاشرے کی طرف سے ہیں۔

مشرف دور سے مدارس کو کنٹرول میں لانے کی بات ہو رہی ہے۔ ہم مختلف نظریات کے حامل لوگ جمع ہو جاتے ہیں لیکن حکومت بے بس نظر آتی ہے۔ حکومت نے خود ہی مدارس کو خودرَو جڑی بوٹیوں کی طرح پنپنے دیا۔

محراب و منبر پر بیٹھنے والے لوگوں میں اسّی فیصد انڈر گریجویٹ ہیں، یعنی ان کے پاس شہادت عالمیہ نہیں ہے۔ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ ظاہر ہے ہم آپ یعنی سول سوسائٹی ذمہ دار ہے کیونکہ آئمہ مساجد اور خطباء کا انتخاب مسجد انتظامیہ ہی کرتی ہے جو اہلِ محلّہ پر مشتمل ہوتی ہے۔ جس قدر قلیل تنخواہیں آئمہ کو دی جاتی ہیں، ان میں انڈر گریجویٹ ہی رکھے جا سکتے ہیں۔

سوال: قاضی جاوید صاحب نے آئیڈیل اسے قرار دیا جو انگریز کرتے تھے۔ یعنی رقص کو یکجہتی کی بنیاد قرار دینا، اردو زبان کو کمزور سمجھنا اور شلوار قمیض کو حقیر سمجھنا، اور یہ کہنا کہ صوفیائے کرام نہ ہندو تھے نہ مسلمان۔ تو جو ہم پڑھتے ہیں کہ لاکھوں لوگ صوفیا کی وجہ سے مسلمان ہوئے، کیا وہ جھوٹ پڑھایا جاتا ہے؟

جواب: اٹھارہویں صدی تک ہم نے فارسی کو اپنایا جو ہندی یا پنجابی سے زیادہ پرانی تھی۔ آج اگر ہندوستان بچا ہوا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ 300 ملین درمیانہ طبقہ انگریزی بولتا ہے۔ ہندوستان کو متحد کرنے والی انگریزی زبان ہے۔ آجکل چین کے لوگوں کی خواہش انگریزی سیکھنا ہے۔ حالانکہ یہ کہا جاتا ہے کہ 2025ء میں عالمی زبان چینی ہوگی، لیکن انگریزی میں علوم ہیں اس لیے چین میں بھی بڑی تیزی سے انگریزی زبان کو پذیرائی مل رہی ہے۔ اور یہ جو میں نے لباس یا رقص کی بات کی ہے یہ میں نے حقائق بیان کیے ہیں، یہ نہیں کہا کہ کیا بہتر ہے کیا نہیں۔

سوال: اکثر علما غریبوں کے لیے مدرسہ بناتے ہیں لیکن اپنے بچوں کو آکسفورڈ کا کورس پڑھاتے ہیں، کیوں؟

جواب: یہ مغربی بالادستی کا نتیجہ ہے۔

سوال: کیا یہ ممکن ہے کہ تمام مدارس میں یکساں نصاب رائج کیا جائے؟

جواب: ویسے تو تمام مدارس میں قرآن، حدیث اور عربی ایک ہی ہے، 80 فیصد نصاب ایک ہی ہے، فرق طریقہ تدریس اور زاویۂ نظر میں ہے۔ اس کو یکساں کرنا ممکن نہیں۔

سماجی ہم آہنگی اور مذہبی رواداری میں اساتذہ کا کردار

دوسری ایک روزہ تربیتی ورکشاپ

16 مئی 2017ء، لاہور

پہلی نشست

صدارت: عمار خان ناصر

مذہبی سکالر، الشریعہ اکیڈمی، گوجرانوالہ

مقررین:
- نظامِ تعلیم اور سماجی ہم آہنگی میں حائل رکاوٹیں

  صاحبزادہ امانت رسول

  مذہبی سکالر، پرنسپل، ادارہ فکرِ جدید، لاہور
- استاد تبدیلی میں کیا کردار ادا کر سکتا ہے؟

  ڈاکٹر شہباز منج

  معلم، سرگودھا یونیورسٹی، سرگودھا
- نصاب یا طریقۂ تدریس، غیر متوازن رویوں کا سبب کیا ہے؟

  مولانا عمار خان ناصر

  مذہبی سکالر، الشریعہ اکیڈمی، گوجرانوالہ

دوسری نشست

صدارت: صاحبزادہ امانت رسول

مذہبی سکالر، پرنسپل، ادارہ فکرِ جدید، لاہور

مقررین:
- انتہا پسندی کیسے پھیلتی ہے؟

  ڈاکٹر عامر عبداللہ

  سیکرٹری جنرل، المؤرد انسٹی ٹیوٹ، لاہور

- نظامِ تعلیم اور مذہبی اقلیتوں کی مشکلات

  حسین نقی

  سابقہ جوائنٹ ڈائریکٹر، ایچ آر سی پی، لاہور
- پاکستان میں تعلیمِ امن

  مجتبیٰ محمد راٹھور

  محقق، ادارہ امن و تعلیم، اسلام آباد

تیسری نشست

صدارت: ڈاکٹر عامر عبداللہ

سیکرٹری جنرل، المؤرد انسٹی ٹیوٹ، لاہور

مقررین:
- پاکستان میں تعلیمی پالیسی کیسے بنتی ہے؟

  مولانا عمار خان ناصر

  مذہبی سکالر، الشریعہ اکیڈمی، گوجرانوالہ
- پاکستانی سماج کو درپیش علمی اور فکری چیلنجز

  مولانا راغب حسین نعیمی

  مہتمم، جامعہ نعیمیہ، لاہور
- پاکستان کا حالیہ فکری منظر نامہ

  قاضی جاوید

  ڈائریکٹر، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور

پہلی نشست

عمار خان ناصر

سماجی ہم آہنگی اور مذہبی رواداری کا تعلق اس نکتے سے ہے کہ کوئی بھی قوم جو اپنے انسانی وسائل کو استعمال نہیں کرتی، ایک دوسرے کی تخریب میں استعمال ہوتی ہے، وہ دنیا میں ترقی نہیں کر سکتی۔ ہمارے ہاں جو قدیم یونانی علمی ورثے کو مسلمانوں نے پڑھا، دوسروں تک منتقل کیا۔ چونکہ انہوں نے دوسروں کے لیے ایسا ماحول پیدا کیا، اس لیے مختلف ثقافتوں کے لوگ ان کے ساتھ کام کرنے پر آمادہ ہوئے۔ مذہبی رواداری کا جب تک ہم حل نہیں نکالیں گے، ہماری قوت تقسیم رہے گی۔

معاشرے کو بدلنے کا کام محض سیاسی قوتوں کا نہیں ہے، ہماری پہلی توجہ ہی حکومت کی طرف جاتی ہے۔ حکومت معاشرے کا ایک حصہ ہوتی ہے، تبدیلی میں سارے ہی طبقات کا کردار ہوتا ہے۔ آج ہم اساتذہ کے کردار پر بات کریں گے اور تھوڑی گفتگو کے بعد ہم آپ سے مشاورت بھی لیں گے۔

آج کی گفتگو کا ہمارا پہلا موضوع ہے کہ نظام تعلیم اور سماجی ہم آہنگی میں کیا رکاوٹیں حائل ہیں جس پر بات کرنے کے لیے ہمارے ساتھ جناب صاحبزادہ امانت رسول صاحب موجود ہیں۔

نظام تعلیم اور سماجی ہم اہنگی میں حائل رکاوٹیں

صاحبزادہ امانت رسول

استاد تبدیلی میں کیا کردار ادا کر سکتا ہے؟

ڈاکٹر شہباز منج

(مقررین کی گفتگو کے اہم نکات پہلی ورکشاپ کی کارروائی میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں)

نصاب یا طریقہ تدریس: غیر متوازن رویوں کا سبب کیا ہے؟

مولانا عمار خان ناصر

امانت رسول صاحب نے طبقاتی تقسیم کے حوالے سے عمدہ گفتگو کی۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ نظام تعلیم شاید طبقات پیدا نہیں کر رہا، یہ تقسیم پہلے سے موجود ہے لیکن اس کا پرتو ہمیں تعلیم میں بھی نظر آتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ دو پہلوؤں سے جدید تعلیم کے اداروں کے اساتذہ مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں۔ سارا معاشرہ ایسا نہیں ہے جو کوئی خاص سانچہ رکھتا ہو، ہمارے پاس مختلف پس منظر سے ایک بڑی تعداد آتی ہے۔ مذہبی فرقہ واریت اب جامعات میں بھی جڑیں پکڑ رہی ہے۔

نصاب یا طریقہ تدریس یہ ساری چیزیں اہم ہیں، نصاب بہترین ہونا چاہیے لیکن ہم یہ موضوع بنا رہے ہیں کہ ان میں مثالی صورتحال موجود نہیں ہے۔ استاد نصاب طے نہیں کرتا لیکن اگر نصاب میں کچھ ناہمواریاں ہیں تو استاد کے پاس اختیار ہے کہ وہ ان کمیوں کو دور کر سکے۔ نصاب میں کچھ کمیاں تو ہو سکتی ہیں لیکن کیا وہ عدم رواداری پیدا کر رہی ہیں؟ شاید ایسا نہیں ہے۔ سماجی رواداری پر اقلیتوں کے لیے کچھ چیزیں شامل کرنی چاہییں۔ جب تک ہم نصاب کو بہتر نہیں بنا دیتے استاد یہ کمی دور کر سکتا ہے۔ ہم اپنا کردار خود طے کر کے اپنی ذمہ داری ادا کر سکتے ہیں۔

سپریم کورٹ کی طرف سے بھی کچھ ہدایات آئی ہیں کہ مذاہب میں ہم آہنگی سے متعلق گریجویشن کی سطح پر ایک مضمون ہونا چاہیے۔ اسی طرح خواتین سے متعلق بھی ایک مضمون رکھا گیا ہے۔

(دوسری اور تیسری نشست میں ڈاکٹر عامر عبداللہ، حسین نقی مجتبیٰ محمد راٹھور، مولانا عمار خان ناصر، قاضی جاوید اور مولانا راغب حسین نعیمی نے گفتگو کی۔ اس گفتگو کے اہم نکات پہلی ورکشاپ کی کارروائی میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں)

سماجی ہم آہنگی اور مذہبی رواداری میں اساتذہ کا کردار

تیسری ایک روزہ تربیتی ورکشاپ

22 مئی 2017ء، اسلام آباد

پہلی نشست

صدارت: ڈاکٹر خالد مسعود

سابق چیئرمین، اسلامی نظریاتی کونسل

مقررین: ○ نصاب یا طریقۂ تدریس، غیر متوازن رویوں کا سبب کیا ہے؟

رشاد بخاری

ماہر سماجیات

○ نظامِ تعلیم اور سماجی ہم آہنگی میں حائل رکاوٹیں

ڈاکٹر حسن الامین

ایگزیکٹو ڈائریکٹر، اقبال انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ فار ریسرچ اینڈ ڈائیلاگ، اسلام آباد

دوسری نشست

صدارت: فتح محمد ملک

سابق وائس چانسلر، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

مقررین: ○ انتہا پسندی کیسے پھیلتی ہے؟

ڈاکٹر خالد مسعود

سابق چیئرمین، اسلامی نظریاتی کونسل

○ نظامِ تعلیم اور مذہبی اقلیتوں کی مشکلات

رومانہ بشیر

ایگزیکٹو ڈائریکٹر، پیس اینڈ ڈویلپمنٹ فورم، راولپنڈی

○ پاکستان میں تعلیمِ امن

مجتبیٰ محمد راٹھور

محقق، ادارہ امن و تعلیم، اسلام آباد

تیسری نشست

سرگرمی: سماجی ہم آہنگی کے لیے اساتذہ کے کردار پر تجاویز

مقرر: ○ پاکستان کا حالیہ فکری منظر نامہ

سید ثاقب اکبر

چیئرمین، البصیرہ ٹرسٹ، اسلام آباد

پہلی نشست

پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز کے زیر اہتمام اساتذہ کرام کے لیے تیسری تربیتی ورکشاپ 22 مئی 2017ء کو ادارہ اقبال برائے تحقیق و مکالمہ کے اشتراک سے بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اولڈ کیمپس کے علامہ اقبال آڈیٹوریم میں منعقد ہوئی۔ ورکشاپ کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا جس کے بعد محمد اسماعیل خان نے ''شدت پسندی کے انسداد کا لائحہ عمل'' کے عنوان سے ابتدائی کلمات پیش کیے جس میں PIPS کا تعارف بھی شامل تھا۔

شدت پسندی کے انسداد کا لائحہ عمل

محمد اسماعیل خان

PIPS گزشتہ دس سال سے پاکستان میں شدت پسندی کے خلاف کام کر رہا ہے۔ پولیس جیسے ادارے اگرچہ فوری طور پر مؤثر ہوتے ہیں، تاہم لوگوں میں شعور پیدا کر کے بھی ہم اس کو روک سکتے ہیں، البتہ یہ طویل مدتی کام ہے۔ ہم نے دس قومی سطح کی ورکشاپس منعقد کیں۔ کسی

نے تعلیمی و تدریسی عمل پر نظر ثانی کا کہا اور کسی نے کلچر پر۔ ہم نے ان دس موضوعات پر تفصیلی مباحثے منعقد کیے۔ ایک رائے یہ سامنے آئی کہ چونکہ دہشت گرد مذہبی تشریح سے استدلال کر رہے ہیں اس لیے علما اپنا نقطہ نظر واضح کریں۔ دوسری ورکشاپ شدت پسندوں کی واپسی کے لیے کوئی راستہ اختیار کرنے پر تھی، بہت سے لوگ اپنے آپ کو آئینی یا معاشرتی طور پر ملک کا حصہ نہیں سمجھتے۔

خلاصہ یہ ہے کہ پاکستان کی سکیورٹی پاکستان کے تنوع میں پوشیدہ ہے۔ ایک بات جو بار بار سامنے آئی وہ تعلیم و تدریس سے متعلق ہے کہ نصاب میں جتنی بھی اصلاح کر لی جائے اگر استاد میں مطلوبہ حساسیت نہیں تو کوئی فائدہ نہیں، اسی وجہ سے یہ ورکشاپ اساتذہ کے لیے رکھی گئی ہے۔

ڈاکٹر خالد مسعود

اسماعیل صاحب نے ادارے کا جو تعارف کروایا وہ بہت مختصر ہے۔ ادارے کا کام کافی تفصیلی ہے۔ جس مسئلے پر بات کی جا رہی ہے یہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں، زندگی اور موت کا سوال ہے۔ ہم ذمہ داری ایک دوسرے پر ڈال رہے ہیں حالانکہ یہ ہم سب کی ذمہ داری ہے، ہم کہتے رہے ہیں کہ یہ مدارس کا مسئلہ ہے لیکن اب پتا چلا کہ یہ تمام تعلیمی اداروں کا مسئلہ ہے۔ اب تبدیلی آ چکی ہے۔ ہماری جو دینی و اخلاقی تربیت گھروں میں ہونی چاہیے وہ نہیں ہو رہی، زیادہ وقت سکول و کالج میں گزرتا ہے۔ مسئلہ اتنا گھمبیر ہے کہ اسے ہم صرف وعظ سے حل نہیں کر سکتے، اسے فلسفیانہ اور نظریاتی طور پر حل کرنے کی ضرورت ہے۔ جہاں سے بات شروع کرنی چاہیے وہ یہ ہے کہ اتفاقات سے ابتدا کریں، جیسا کہ آئین۔ مختلف پروگراموں میں اساتذہ طلبہ کے ساتھ بیٹھ کر بات کریں، اس کی اہمیت کو صحیح طور پر آپ ہی سمجھ سکتے ہیں کہ آپ کا طلبہ کے ساتھ براہ راست تعلق ہے۔ اساتذہ سے جو بات انہیں ملے گی وہ اسے سنیں گے۔

ہم ادارے کا اب تک کا کام آپ کے سامنے پیش کریں گے اور پھر آپ کے تجربے کی روشنی میں مسئلے کا حل تلاش کریں گے۔ سب سے پہلے رشاد بخاری صاحب طریقہ تدریس پر بات کریں گے۔

نصاب یا طریقہ تدریس: غیر متوازن رویوں کا سبب کیا ہے؟

رشاد بخاری

موضوع پر پہلے ہمیں اتفاق رائے پیدا کرنے کی ضرورت ہے، مختلف موضوعات کے اساتذہ یہاں جمع ہیں، اس سے ایک تنوع پیدا ہو گیا ہے۔ آپ سب درس و تدریس سے وابستہ ہیں اور جانتے ہیں کہ تعلیم دوطرفہ عمل ہے۔ جب تک سننے والے سے ربط وضبط نہیں ہو گا بات صحیح طرح نہیں پہنچے گی۔ یہ پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ کیا سننے والے نے آپ کی بات سمجھ لی ہے؟ جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا؟ موضوع سے بظاہر یہ نظر آ رہا ہے کہ ہمارے نصاب میں یا طریقۂ تدریس میں کوئی خرابی ہے، اور اگر غیر متوازن رویے پیدا ہو رہے ہیں تو اس کا مظہر کیا ہے؟

سوال: نصاب ہمارے سماج کے تمام رویوں کی صحیح طرح عکاسی نہیں کر رہا، استاد طالب علم کو نصاب تک محدود رکھتا ہے جس کی وجہ سے معاشرے کے رویے درست طور پر اسے سمجھ نہیں آتے، دوسرا یہ کہ ہم فکری تربیت نہیں کرتے، صرف نمبروں کی دوڑ میں لگے ہوئے ہیں۔ اردو ادب کے موضوعات کا اطلاق آج کے رویوں کے مطابق نہیں ہے۔ اردو کے نصاب میں جو غزلیات وغیرہ کا حصہ ہے وہ آج کے دور سے مطابقت نہیں رکھتا، آج کے دور سے مطابقت رکھنے والا ادب تخلیق کریں۔ مجھ جیسا کمزور استاد اپنے آپ کو نصاب تک محدود رکھتا ہے۔

سوال: استاد کی باتیں نہیں کردار اثر رکھتا ہے، کردار سازی کی ضرورت ہے۔ جب طالب علم استاد کے سامنے آئے گا تو لازمی طور پر اثر ہو گا، ابلاغ کا فقدان ہے۔

سوال: میں نے بنیاد پرستی پر کچھ تحقیقی مقالے لکھے ہیں، فاٹا پسماندہ علاقہ ہے، وہاں پر استاد

جاتا ہے تو وہ اپنا اثر نہیں دے پاتا بلکہ طلبہ کا اثر قبول کر لیتا ہے، پسماندگی کے خاتمے سے بھی کافی مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

سوال: اساتذہ کی ہمارے معاشرے میں قدر نہیں، مدرسہ کے استاد کو احترام دیا جاتا ہے، ہمارے طلبہ ٹی وی پر سیاستدانوں کی لڑائیاں اور گالیاں سن کر برباد ہو رہے ہیں۔ استاد کی عزت کم کیوں ہوئی؟ اس کی وجہ بھی دریافت کرنا ہوگی۔ پرائیویٹ سکولوں کی وجہ سے احترام میں کمی آئی ہے، سیاسی اثر ورسوخ بھی سبب بنا۔

جواب: ہمارے ہاں علم کی بجائے مادیت اور طاقت کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے جس کی وجہ سے غیر متوازن رویے پروان چڑھتے ہیں۔ خود آگاہی، علم اور تدریسی مہارت، ان تین چیزوں کا استاد میں پایا جانا ضروری ہے، خود آگاہی، اس کے رجحانات کیا ہیں؟ اس کی گفتگو کے ذریعے تعصّبات کسی نہ کسی انداز میں اس کے طلبہ میں منتقل ہو رہے ہیں، طلبہ میں پائی جانی والی خامیوں میں کچھ اساتذہ کی طرف سے بھی منتقل ہوتی ہیں۔ تعلیم وتدریس کے میدان میں مسلسل پیش رفت ہو رہی ہے، دیکھنا یہ ہے کہ کیا وہ جدید دور کے مطابق ہے؟ کیا آپ کو کسی دوسرے شہر کے اپنے مضمون کے استاد سے تعامل ہوا کہ اسے کیا مسائل درپیش ہیں؟ ہم ایک ہی نصاب پڑھاتے رہتے ہیں اور صفحہ نمبر بھی یاد ہو جاتا ہے۔ اگر ایک استاد پندرہ سال سے ایک ہی کتاب پڑھا رہا ہے تو اسے یاد تو ہوگی۔ ہم مسلکی یا نسلی برتری کو سب میں منتقل کر رہے ہوتے ہیں، اس سے بھی تفرقہ جنم لے رہا ہوتا ہے۔

تیسری چیز تدریسی مہارت کی ہے، کیا ہر آدمی کسی ایک ہی مہارت سے سیکھتا ہے؟ ہمیں اپنے طلبہ کا جائزہ لینا ہوگا، ان کے مختلف پس منظر ہوں گے، ایک ہی طریقے سے پڑھانے سے کیا سب میں علم منتقل ہو جائے گا؟ جن طلبہ کی تربیت مختلف انداز سے ہوئی وہ تو نالائق رہ جائیں گے، کیا اس حکیم کی طرح مثال نہیں ہوگی کہ مریض میں ہی مسئلہ ہے؟ کبھی ہم نے اپنے طریقہ تدریس پر غور کیا؟ استاد کی نفسیات اور رویہ ہی طالب علم کی ذہن سازی کر رہا ہوتا ہے۔ ہمیں یہ ہی

معلوم نہ ہو کہ ہم کیا چیز اور کس طریقے سے منتقل کر رہے ہیں تو نتیجہ کیا نکلے گا؟

اگر وقت ہوا تو ہم متوازن اور غیر متوازن رویے پر بات کریں گے۔ میرے پاس یہ سوال نامہ ہے جس پر بارہ سوالات درج ہیں، ان پر زیادہ غور وفکر کے بغیر جو پہلا جواب آپ کے ذہن میں آئے اس پر نشان لگا دیں۔

سرگرمی

اس سرگرمی سے امتحان مقصود نہیں تھا، محض یہ واضح کرنا تھا کہ جن کے جواب میں ''اے'' زیادہ ہے وہ بصری عمل سے زیادہ سیکھتے ہیں، یعنی تصویروں، ڈائیگرام اور ماڈل کے ذریعہ زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔ ''بی'' والے سمعی طور پر ذہین ہیں، لیکچر اور اجتماعی مکالمے میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ ''سی'' والے لوگ چیزوں کو اس وقت سمجھتے ہیں جب وہ خود کریں، ایسا طالب علم عملی تجربے کو ترجیح دیتا ہے، ان تینوں کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے طلبہ کے سیکھنے کے انداز مختلف ہو سکتے ہیں۔ ہمیں اپنے طریقہ تدریس میں اس طرح کی مختلف چیزیں شامل کرنی چاہییں تاکہ سب طلبہ بہتر طریقے سے سیکھ سکیں۔

انتہا پسندی کی ایک وجہ شکایتیں بھی ہیں۔ جو طالب علم یہ سمجھتا ہے کہ اس پر کلاس میں توجہ نہیں دی جا رہی اس میں شکایت پیدا ہوگی اور وہ غصے کا شکار ہوگا، اس کی پڑھنے میں یا اس مضمون میں دلچسپی کم ہو جائے گی۔

سوال: تدریس میں جو رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں ان کا حل کیا ہے؟ کیا اس کے لیے مناسب نہیں کہ استاد کو براہِ راست کلاس میں بھیجنے کی بجائے پہلے تربیت کر کے بھیجا جائے؟

جواب: یہ بہت ضروری ہے، یہ ایک مہارت کا نام ہے، یہ ہمارے نصاب کا حصہ تو ہے لیکن اس پر اس طرح عمل نہیں ہو رہا، ہر استاد کو پہلے بھی تربیت سے گزارا جائے اور ساتھ ساتھ بھی ریفریشر کورسز ہونے چاہییں۔

صدر مجلس ڈاکٹر خالد مسعود: ہم تعلیم کے تصور میں ایک نئے دور سے گزر رہے ہیں، پہلے یہ کوشش ہوتی تھی کہ مصنف سے ہی وہ کتاب پڑھی جائے اس میں طلبہ سفر اختیار کرتے تھے، پھر مدرسے بنے جس میں استاد املا کرواتا تھا۔ اس نظام میں ڈگری میں لکھا ہوتا تھا کہ فلاں فلاں کتابیں پڑھی گئیں، اس میں بھی اساتذہ طلبہ سے گفتگو کرتے اور تربیت کرتے۔ مدارس کل وقتی ہیں، اس میں اساتذہ کی اتنی تعظیم کی جاتی ہے کہ طالب علم سوال نہیں کر سکتا۔ اس نظام کو بدلنے کی ضرورت ہے، ذاتی توجہ دے کر تربیت کی جائے۔

نائیجیریا میں مثلاً انگریزی کے اساتذہ کی اپنی ایک تنظیم ہے جس میں وہ پرچے بھی بناتے ہیں، تربیت بھی کرتے ہیں، ہم اپنے طور پر اس طرح کے کام کر سکتے ہیں۔ ہم عام طور پر یہ دیکھتے ہیں کہ میں یہ مضمون طالب علم کو منتقل کر دوں، یہ نہیں دیکھتے کہ اس میں نئی چیزیں کیا آئی ہیں ان کا مطالعہ کر کے جائے۔ دوسری چیز طلبہ کو یہ کہنا کہ ایک سوال کا ایک ہی جواب ہے تو یہ کہنا چھوڑ دیں، اس سے بھی شدت پسندی پیدا ہوتی ہے۔ علم بڑھتا ہے تو اس میں صورتیں بدلتی ہیں، ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس مسئلے میں یہ یہ آراء ہیں اور یہ یہ بہتر ہے۔ یہ بہت اہم ہے کہ اب لیکچر کی بہت اہمیت نہیں رہی، بحث و تمحیص کو اپنایا جاتا ہے، لیکچر اور امتحانات ہمارے تعلیمی نظام کو بہت نقصان پہنچا رہے ہیں، اچھے نمبر لینا علم کی دلیل نہیں۔

نظام تعلیم اور سماجی ہم آہنگی میں حائل رکاوٹیں

ڈاکٹر حسن الامین

پہلی بات تو یہی ہے کہ ہم آہنگ سماج کیا ہے؟ میرے خیال میں ایسا سماج جس میں دلیل کی بنیاد پر بات ہوتی ہے اور ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کی جائے، جس میں برداشت اور تحمل پایا جائے۔ مجھے اس کی قریب تر مثال موسیقی کی ملی ہے، جب تار کی ساری آوزیں ملتی ہیں تو موسیقی اور ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے، ان سب آوازوں میں انفرادی آواز ختم نہیں ہو جاتی، سب

اقلیتیں موسیقیت پیدا کریں، اس وقت ہم شور شرابے والی کیفیت میں ہیں۔ ہم آہنگ سماج وہ ہے جس میں اس کی تمام اکائیوں کے مفادات کو تحفظ حاصل ہو۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ سماج کسے کہتے ہیں؟ بحیثیت استاد آپ سماج کو کیسے دیکھتے ہیں؟

میرے مطابق ریاست اور خاندان کے ادارے کے درمیان جو جگہ ہے، اسے سماج کہتے ہیں۔ تعلیمی نظام یعنی سکول، کالج، مدرسہ اس ہم آہنگ سماج کے ساتھ کیسے متعلق ہوتا ہے؟ میرے سامنے چند مسائل ہیں، پہلا مسئلہ نسلی ہے، بٹ، آرائیں، چوہدری و دیگر۔ ہمارے گاؤں میں ٹریننگ کے لیے جانے والے اکثر غیر خاندانی پشتون تھے۔ ان کے معاشی حالات اگر ٹھیک بھی ہو گئے ہیں تو لوگ انہیں رشتے نہیں دیتے۔ ہمارا تعلیمی نظام اس موضوع کو کسی بھی طرح نہیں دیکھتا۔

دوسری چیز یہ کہ خود مذہب کے اندر بڑے مباحث ہیں، دیوبندی علما نے کبھی موسیقی کی محفلوں پر حملے نہیں کروائے، وہ ان محفلوں میں بیٹھتے تھے، علاقائی کلچر کے ساتھ وہ ہم آہنگ تھے، لیکن کچھ عرصہ بعد ہم آہنگی خراب ہو گئی۔

تیسری چیز سیاسی ہے، ہم 'نیشن سٹیٹ' میں رہتے ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ صبح شام ہم مختلف نام سنتے ہیں جس سے تنازعہ پیدا ہوتا ہے، کارڈ میں لکھا ہے قوم افغان اور قومیت پاکستانی۔ چوتھی چیز قومیت اور اس کے مسائل ہیں، جس میں صوبوں کے حقوق، زبان کے مسائل جس کی وجہ سے ہم پورا صوبہ کھو چکے، اس پر بھی ہمارا تعلیمی نظام بری طرح ناکام ہوا ہے۔

پانچواں مسئلہ تکثیریت کا ہے، جو اقلیتیں ہمارے اردگرد رہتی ہیں کیا ہم جو حقوق اپنے لیے مانگتے ہیں، انہیں بھی دے رہے ہیں؟ ہمارے ہاں ہندو کے ساتھ مستقل دشمنی کا تصور ہے۔ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ مکہ میں حضورؐ اقلیت میں تھے تو اکثریت کے ساتھ کیسے رہتے تھے؟ یا مدینہ میں اقلیتوں کے ساتھ کیا رویہ تھا؟

آخری مسئلہ یہ ہے کہ سماج میں جو طبقاتی تبدیلی آ رہی ہے، لوگ گاؤں سے شہر میں آ رہے

ہیں۔ پیسے آ رہے ہیں لیکن اقدار نہیں۔اس تبدیلی میں شدید انتشار کی کیفیت ہوتی ہے۔قدیم سے تعلق ٹوٹ رہا ہوتا ہے اور جدید کے بارے میں پتا نہیں ہوتا، نئے کو پوری طرح سمجھیں نہیں اور پرانے کو بھی چھوڑ دیں، یونیورسٹیاں اس نظام سے پوری طرح کٹی ہوئی ہیں۔ہمیں اس پر بھی سوچنا ہے کہ سماج تبدیل ہو رہا ہے تو اس کی کیا ضرورتیں ہیں؟ کیا تعلیمی ادارے کمرشل ہیں؟ عوامی سرمائے سے یہ ادارے چلتے ہیں اس لیے یہ سماج سے خود کو الگ نہیں کر سکتے۔سماج کی شکل نے تعلیمی نظام کو ترتیب دیا ہے، ریاست کو اس میں کردار ادا کرنا ہوگا لیکن یہ کسی بھی سطح پر اس کی ترجیحات میں شامل نہیں ہے۔ایسے میں، مَیں سمجھتا ہوں کہ مدرسہ غنیمت ہے۔

شرکاء کے تبصرے

تبصرہ: نصاب میں کوئی غلطی نہیں، ٹیچر اپنے آپ کو ٹھیک کرے۔

تبصرہ: غیر متوازن اور غیر ہم آہنگ سماج کی وجہ یہ ہے کہ ہم خود غیر ہم آہنگ ہیں، اسلامیات کے استاد کی ایک خاص تربیت ہوتی ہے دوسری طرف کے اساتذہ نے مدرسہ نہیں دیکھا ہوتا تو ہم آہنگی نہیں پیدا ہوتی، اساتذہ کو ہم آہنگ کرنے کی ضرورت ہے۔

تبصرہ: طلبہ اور اساتذہ میں پہلے خلا کو ختم کرنا ہوگا، نصاب میں ایسی چیزیں لائیں جن سے طلبہ سے تعلق فروغ پائے۔

تبصرہ: ہمارے ہاں مدارس یا سکولوں میں پڑھایا تو جاتا ہے لیکن سکھایا نہیں جاتا، تعلیم کو ہم ڈگری کے حصول کا نہیں تربیت کا ذریعہ بنائیں۔

صدر مجلس ڈاکٹر خالد مسعود: یہ ورکشاپ اس بات کا جائزہ لینے کے لیے تھی کہ جو ہم کر رہے ہیں، کیسے اس میں بہتری لائیں؟ جب ہم کہتے ہیں کہ معاشرہ یا ریاست ساتھ نہیں دے رہی اس سے مایوسی بڑھتی ہے، ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ اسی میں ہم کچھ کریں۔

ایک تو نصاب کے بارے میں تصور بدلنے کی ضرورت ہے۔اس کا مقصد یہ تھا کہ میٹرک تک ایسی مہارتیں دے دی جائیں جو زندگی میں کام آئیں۔اس کے بعد کالج میں کسی خاص فیلڈ کی بنیادی اصطلاحات اور تصورات واضح کیے جائیں تاکہ آئندہ طالب علم اسے مزید آسانی کے ساتھ پڑھ سکے۔

استاد کا کام صرف علم کی ترسیل نہیں بلکہ درپیش مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت ہونا بھی لازم ہے۔ہم نے تنوع سے کیسے عہدہ برآ ہونا ہے؟ مسئلے کو ایسے ترتیب دیا جائے کہ وہ حل کی طرف جائے، فتوے والوں کا علم بھی محدود ہے اس لیے مسائل بڑھ رہے ہیں۔ہر سطح پر ہمیں بتانا ہوگا کہ مسئلہ حل کیسے ہوگا؟ مدارس میں بھی استدلال نہیں بتایا جاتا، یہ بتاتے ہیں کہ اختلاف تو ہے لیکن ہمارا مسئلہ ٹھیک ہے۔اختلاف حد درجہ زیادہ ہے۔ہم ہر شخص کو یہ مہارت دیں کہ اختلافات کو سمجھنے کا طریقہ کیا ہے۔ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اساتذہ اور طلبہ میں دوری ہے۔جب تک یہ مسائل حل نہیں ہوتے کم از کم اساتذہ طلبہ کے ساتھ بیٹھ کر گفتگو کریں کہ کیسے حل ہو سکتے ہیں؟ اگر اختلافات کو تصادم بنائیں گے تو دونوں فریق کمزور ہوں گے۔

آپ کی طرف سے جو باتیں بھی سوالات کی صورت میں سامنے آئیں، یہ ادارہ متعلقہ اداروں تک انہیں پہنچا سکتا ہے۔اس ادارے کی جو دس نشستیں ہوئیں، ان سے کافی امید پیدا ہوئی ہے کہ لوگ یہ باتیں سننے کے لیے تیار ہیں۔

دوسری نشست

انتہا پسندی کیسے پھیلتی ہے؟

ڈاکٹر خالد مسعود

ہمارے ملک میں انتہا پسندی کیسے پھیلی؟ اس سے پہلے ایک سوال یہ ہونا چاہیے کہ انتہا پسندی ہے کیا؟ کیسے شروع ہوتی ہے؟ اور پھر ختم کیسے ہو سکتی ہے؟ یہ ایکسٹریم ازم کا ترجمہ ہے کہ آپ ایک

حد پر جا کر کھڑے ہو جائیں۔ قرآن میں اس کے لیے 'غلو' کا لفظ آیا ہے، جدید دور میں نیا لفظ تطرف کا آیا ہے یعنی افراط یا تفریط۔ ان سب کی تعریفات سے یہ جھلکتا ہے کہ ہر زمانے میں وہ مسئلہ کیسے سمجھا جا رہا تھا۔ غلو کا تعلق دین سے ہے۔ اختلاف ہماری روایت میں اچھی چیز سمجھی جاتی ہے، یہ رحمت ہے، ساری کائنات کی تخلیق میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ انتہا پسندی اختلاف سے شروع ہوتی ہے۔ جب تک آزادی رائے رہی اس وقت تک تو اختلاف کا احترام کیا گیا اور قرآن میں بہت اچھے طریقے سے بتایا گیا ہے کہ جو مخاطب بات کو نہ سمجھتا ہو تو قالوا سلاما لیکن دوسری طرف کوئی بات سمجھنے والا ہے تو جادلھم بالتی ھی احسن۔ فقہ میں شروع میں بیس کے قریب مذاہب سامنے آئے۔ جب تک تو اختلاف اتفاق کے لیے ہے، مکالمے کے لیے اور استدلال کے ساتھ ہے تو یہ رحمت ہی رحمت ہے۔ اور جو تفرقہ ہے کہ 'جو میں سمجھتا ہوں وہ درست ہے' اس کی مخالفت کی گئی۔

خلافت عباسی میں جب عقل پسند معتزلہ نے سمجھا کہ کلام کی سب سے اچھی شکل ان کے پاس ہے اور خلیفہ مامون نے اسے جبر سے نافذ کرنا چاہا تو اس میں وہ بھی ناکام رہے اور خلیفہ بھی، اختلافات کو حفاظت دینے کے لیے اور قائم رکھنے کے لیے مذاہب ہیں۔

قرآن مجید کا تصور 'غلو فی الدین' یہ ہے کہ جو چیز دین میں ہے نہیں اس کو دین میں داخل کرنا اور اس پر اصرار کرنا کہ یہ دین ہی کا مسئلہ ہے۔ کچھ چیزیں دین ہیں اور کچھ چیزیں نہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہم نے اقتدار اور سیاست کو دین اور عقائد کا حصہ بنا دیا۔ اقتدار دین میں شامل ہوا، عباسی اور اموی زمانے میں سیاست انتخاب کی بجائے موروثی ہوگئی، پھر طاقت کے زور پر چھیننا حصول اقتدار کا ذریعہ بن گیا، فقہا نے اسے بھی جائز بتایا اور حد بتائی کہ سلطان اور خلیفہ کے کیا اختیارات ہوں گے، الماوردی نے اس مسئلے کو حل کیا۔

بش کے زمانے سے امریکہ کی سیاست یہ ہے کہ ایگزیکٹو پر کوئی پابندی نہ لگائی جائے۔ الماوردی نے کہا کہ خلیفہ امت کا منتخب کردہ ہوتا ہے، باقی کو اختیارات تفویض کیے گئے ہیں،

اختیارات دینے والے کی اتھارٹی زیادہ ہوگی، غیر دینی اشیا کو دین میں شامل کر کے غلو فی الدین کیا گیا، پھر کافر زندیق اور فاسق کے احکام لگائے گئے، اس کے بعد ایک اور عنصر آیا غلبے کا، کہ جب ہماری عصبیت ہے، ہم حق پر ہیں تو ہماری بات ہی مانی جائے۔

آج کی بحثوں میں غلو فی الدین، تطرف کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ جو علما مرکزی فکری دھارے سے ہٹ کر بات کر رہے ہوں، ان کا احترام کیا جائے، ان کی بات مانی جائے۔ اب علما کا تصور یہ ہے کہ جو مدرسے کا پڑھا ہوا نہیں ہے، وہ عالم نہیں چاہے پی ایچ ڈی کر رکھی ہو۔

جتنی بھی حکومتیں آزادی کے بعد قائم ہوئیں وہ عوام کو اہمیت نہیں دیتی تھیں، ہماری انتظامی کمزوریوں کو جبر سے دور کیا جاتا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ جو بھی جبر کر رہے ہیں وہ صحیح نہیں لیکن راستہ یہ اختیار کیا کہ دین کا تصور دیا، جو ریاست اور خلافت کی تعریف کی، وہ دین کا حصہ بن گئی۔ چونکہ یہ اسلامی استدلال کے ساتھ بیان ہو رہا ہے اس لیے اس کی مخالفت نہیں ہو سکتی، نتیجہ یہ نکلا کہ جہاد، جمہوریت اور قانون کی جو تعریفات انہوں نے کیں وہ یا تو ناممکنات میں سے تھیں یا تیاری نہیں تھی، جب انہوں نے دوسرے ملکوں پر حملے کیے کہ اصل جہاد کافروں کے علاقوں میں جا کر لڑنا ہے، اس سے پوری دنیا ہمارے خلاف ہوگئی اور ان کے سارے نظام اکٹھے ہو گئے۔ اب بدل رہے ہیں لیکن پہلے یہی کہتے تھے کہ اسلام کی وجہ سے ایسا ہو رہا ہے۔ ہم ایسی جگہ پر کھڑے ہو گئے تھے کہ جہاں پر علما بھی کہتے تھے کہ یہ اصل اسلام نہیں ہے، اس انتہا پسندی کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ اس وقت یہ کہنا صحیح نہیں، کیونکہ جو اس پر کتابیں ہیں وہ بہت واضح ہیں اور جو جوابات لکھے گئے وہ غیر شافی ہیں۔ اسلام کا بنیادی کنٹری بیوشن یہی تھا اختلاف، اسلام میں تنوع کو برداشت کرنے کی قدریں تھیں اسی وجہ سے اسلام اتنی تیزی سے پھیلا، بہت سی قومیں اپنی روایات کے ساتھ اسلام کا حصہ بنیں۔

پہلے ہجرت غیر مسلم سے مسلم ممالک میں ہوتی تھیں اب اکیسویں صدی میں مسلمانوں نے ہجرت کی اور پھر جا کر وہی حقوق مانگے۔ ہماری فقہ میں ہے کہ جو علاقے لڑ کر فتح ہوں ان میں

اقلیتوں کے حقوق اور ہیں، ہم نے تمام غیر مسلموں کے ساتھ ذمیوں کا سلوک کیا۔ جب خود ہجرت کی تو صورتحال کچھ اور نظر آئی، اسلام اس وجہ سے پھیلا لیکن اب کمزوریاں ہمارے اپنے معاشی اور علمی نظام میں ہیں، ہم نے جبر کا نظام بنایا، اختلاف رائے کا نظام نہیں بنایا۔ ہم ایسے مقام پر ہیں کہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیسے مسئلے کو حل کیا جائے؟ ہمیں تعلیمی اداروں سے علمی طور پر رہنمائی نہیں مل رہی۔

نظام تعلیم میں اقلیتوں کی مشکلات

رومانہ بشیر

میں کوشش کروں گی کہ ان چیزوں کا ذکر ہو کہ کیسے ہمارا تعلیمی نظام مذاہب کو تقسیم کرتا ہے؟ کیا استاد پر بھی مذہبی شناخت کا رنگ زیادہ غالب رہتا ہے؟ غیر مسلم پاکستانیوں کے مسائل بھی سامنے آتے ہیں۔ شروع میں، میں کہوں گی کہ پاکستان کے آئین میں آرٹیکل 22 میں مذہبی آزادی کو بڑی اچھی طرح بیان کیا گیا ہے کہ بچے کو کسی ایسی جگہ جانے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا جہاں اس کے مذہب کے خلاف ہدایات دی جا رہی ہوں، پھر ہمارے تعلیمی بورڈ میں یہ ہدایت ہے کہ ایسا کوئی مواد نہ ہو جو کسی کی دل آزاری پر مبنی ہو، لیکن جو نصاب ہم پڑھا رہے ہیں اس میں بہت دل آزاری کی باتیں ہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ پاکستان میں جس طرح سیاست کروٹ لیتی ہے اس کا اثر تعلیمی نظام پر بھی پڑتا ہے، سیاست اور مذہب تو ایک ہی ہیں سیاست اور تعلیم کو بھی ایک کر دیا گیا ہے۔

کیا تعلیمی بورڈ کے سامنے یہ بات ہوتی ہے کہ یہاں غیر مسلم بھی موجود ہیں؟ جب ہمارے نصاب میں اسلامیات ہے تو ہر مواد کو اسلامی کیوں بنایا جاتا ہے؟ استاد صرف استاد ہے یا مسلم استاد؟ مدرسے بھی بہت ہیں لیکن ہمارے پبلک تعلیمی ادارے بھی مدرسے کی شکل اختیار کر رہے ہیں۔ حافظ قرآن کو بیس اضافی نمبر دیے جاتے ہیں، پروفیشنل فیلڈ میں جاتے وقت یہ بیس نمبر

غیر مسلم کو نہیں مل سکتے، اس کا متبادل غیر مسلم کے لیے کیا ہے؟ میں کچھ مثالوں سے بات کروں گی۔ اساتذہ کا رویہ چیلنج ہوتا ہوا نظر آتا ہے، وہ رویے جو مشاہدے میں آ رہے ہیں، میں نے ہندو کمیونٹی سے پوچھا کہ آپ کے بچے کیوں نہیں پڑھ رہے؟ انہوں نے کہا جب تک مذہب معلوم نہیں ہوتا تو معاملات ٹھیک رہتے ہیں لیکن جب مذہب معلوم ہو جاتا ہے تو مسائل کھڑے ہو جاتے ہیں، استاد بھی طنز کرتے ہیں، پھر یا تو بچے سکول چھوڑ دیتے ہیں یا ہم نام تبدیل کر دیتے ہیں۔

چھٹی جماعت کی تاریخ کی کتاب میں سومنات کے مندر توڑے جانے کا ذکر ہے، عبادت گزاروں نے کہا کہ بیچ دیں۔ غزنوی نے کہا کہ میں بت شکن ہوں بت فروش نہیں، کیا یہ ہماری تاریخ ہے؟ یہ سوچنا ضروری ہے کہ ہمارے ساتھ اس مذہب کے جو لوگ ہیں وہ کیسا محسوس کریں گے؟ پھر اس پر ڈراما بھی کر کے دکھانا ہے، ڈراما کرتے وقت اس مذہب کے طلبہ کہاں جائیں گے؟

معلومات عامہ کی ایک کتاب ہے جس میں حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں وہ تصور موجود ہے جو عیسائیت کے مطابق نہیں، مسیحی کہتے ہیں انہیں صلیب دی گئی، جبکہ ہماری کتابوں میں ہے کہ انہیں اٹھا لیا گیا اور یہ کہ بائبل میں تحریف کی گئی، اس سے ہم بچوں کو دوسرے مذاہب کا احترام کیسے سکھائیں گے؟

اسی نصاب میں یہ بات ملتی ہے کہ جب ہم کانگرس کی بات کرتے ہیں کہ اس نے جانبداری کا مظاہرہ کیا، جب ہم کہتے ہیں آخری صدر مولانا آزاد ہیں جو سات سال صدر رہے۔ تحریک پاکستان میں ہم یہ باور کرواتے ہیں کہ یہ صرف مسلمانوں کی تحریک تھی، ہم نے وہ سارا حصہ ہی چھوڑ دیا جس میں غیر مسلموں نے بھی قائد کا ساتھ دیا۔ آخری اسمبلی میں جب ووٹ ٹائی ہو جاتے ہیں تو اس وقت کے مسیحی سپیکر اٹھ کر مسلم لیگ کے حق میں کاسٹ کرتے ہیں اور پاکستان کا وجود سامنے نظر آنے لگتا ہے۔ ہم یہ بھی نہیں بتاتے کہ جب زخمی حالت میں مہاجرین پہنچے تھے تو ان کی مرہم پٹی کرنے والے مسلمان نہیں تھے۔

2016ء میں فیصل آباد میں آٹھویں جماعت کا زبانی امتحان دینے کے لیے نوید رفیق نامی بچہ بیٹھا تھا۔ اس سے کہا گیا کہ تم کلمہ پڑھو، اس نے جواب دیا کہ میں مسیحی ہوں، اسے کہا گیا کہ تم فیل ہو۔ جب یہ واقعہ دوسرے استاد کے سامنے آیا تو پھر اس استاد کی سرزنش کی گئی اور تین سال تک پروموشن روک دی گئی۔ شاید استاد کا یہی رول ہے جو دوسرے استاد نے اپنایا۔ اگر استاد اپنا کردار ادا کر رہا ہوگا تو ہم ماحول بہتر بنانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

ہم بچوں کو متضاد الفاظ یاد کرواتے ہیں تو مسلمان کا متضاد کافر بتاتے ہیں۔ ہمیں حساسیت کے ساتھ الفاظ استعمال کرنا چاہییں۔

23 مارچ 1940ء کے حوالے سے میں نے پوچھا کیا ہوا تھا؟ کسی نے کہا پاکستان بن گیا تھا۔ رٹے رٹائے جملے تھے۔ کسی کو نہیں معلوم کہ اس قرارداد کا متن کیا کہتا ہے؟ اس میں اقلیتوں کے حقوق کی بات ہوئی تھی اور لکھا ہوا تھا کہ مسلمان اقلیت میں تھے۔ ہم نے اس کا متن کبھی بچوں کو نہیں سمجھایا۔ اس میں تمام اقلیتوں کے حقوق کی بات ہوئی تھی۔ جو نفرت کی آبیاری ہم نے تعلیم کے ذریعے کی ہے، کلاس کے بچے یہ کہتے ہیں کہ ہم شیعہ یا ہندو کے ساتھ نہیں بیٹھیں گے۔ آج امن ہماری درسگاہوں سے اٹھ گیا ہے۔

سوالات وتبصرے

تبصرہ: جو صورتحال ہمارے ملک میں ہے شاید تعلیم یا دین سے دوری کی وجہ سے ہے، اس کو دین سے نہ جوڑا جائے۔ میرے خیال میں غیر مسلموں کے لیے الگ سے نصاب ہونا چاہیے، اگر کل کوئی یہ کہے کہ قرآن میں بھی ہے کہ حضرت عیسیٰ کو صلیب نہیں دی گئی تو ہم قرآن پڑھانے سے بھی انکار کر دیں؟ سب سے بڑی نعمت ایمان ہے اس کا انکار کفران ہے۔ تثلیث کے قائلین کے لیے باقاعدہ کفر کا لفظ آیا ہے۔ غیر مسلم کہیں یا کافر کوئی فرق نہیں، اصل بات یہ ہے کہ انہیں حقوق دیے جائیں۔ غزنوی نے سومنات کا مندر کیوں توڑا تھا؟ اس کی وجہ بھی بیان

کی جانی چاہیے۔

تبصرہ: یہاں ہندو، عیسائی مسلمان اکٹھے رہتے رہے، مسلمانوں پر بہت ظلم ہوتا رہا، بچوں کو شناخت دینے کے لیے کچھ تو پڑھانا ہوگا۔ ان کے لیے مشنری سکول موجود ہیں۔

جواب: وہ ان میں نہیں پڑھتے، مشنری سکول بہت مہنگے ہیں، عام شہریوں کے بچوں کا ان میں داخلہ لینا ممکن نہیں۔ بات سرکاری سکولوں کی ہو رہی ہے جو سب کے لیے ہیں۔

سوال: کیا ہم اقلیتوں کے حقوق کی پاسداری میں اپنے تشخص کو ہی مٹا دیں؟ کیا حقائق سے ہی منہ موڑ لیا جائے؟

جواب: ماہرین تعلیم کہتے ہیں کہ پہلے پانچ سال پرسنالٹی کی تعمیر کے لیے ہوتے ہیں، بڑی سطح پر بیٹھ کر جو مرضی پڑھائیں۔ پاکستان میں کوئی ذمی نہیں ہے، قائد نے بتایا کہ یہاں پاکستانیت کی بنیاد پر شہری ہیں مذاہب کی بنیاد پر نہیں۔

سوال: کیا ہم حافظ کی محنت کا نقصان کیے بغیر کسی کو نہیں دے سکتے؟

جواب: میں نے حافظ قرآن کی مخالفت نہیں کی، حکومت کو بھی یہی تجویز دی گئی ہے کہ اقلیتوں کی مذہبی تعلیم کا بھی سرٹیفکیٹ اگر ہو تو انہیں بھی بیس نمبر ملیں۔

سوال: کیا پاکستان دوقومی نظریے پر نہیں بنا؟

جواب: پاکستان بننے سے پہلے کی تاریخ تو یہی ہے اور یہ ہماری تاریخ رہے گا، لیکن پاکستان بننے کے بعد اور 1971ء کے بعد ہم یہ بات نہیں کر سکتے۔ گلگت سے اسلام آباد آنے کا سفر یہاں پہنچنے کے لیے تھا، کیا دوقومی نظریہ انڈیا کے ساتھ مستقل لڑائی کے لیے تھا؟ تاریخ کی حد تک تو ٹھیک ہے، اب اس کی کوئی ضرورت نہیں۔

سوال: آرٹیکل 22 کا کسی کو پتا نہیں، اس کی تشہیر کرنی چاہیے۔ ہم نے انتہا پسندی کو مذہب سے جوڑا ہے، کیا جمہوریت انتہا پسندی کی طرف نہیں لے جا رہی؟

صدر مجلس فتح محمد ملک: دوقومی نظریے پر 71ء میں مہر تصدیق ثبت ہوگئی، وہ ہندوستانی بنگال میں

بھی شامل ہو سکتے تھے لیکن نہیں ہوئے، اس کا مطلب ہے کہ دوقومی نظریہ ختم نہیں ہوا، ہم نے تحریکِ آزادی کے دوران جداگانہ حیثیت سے ملک حاصل کیا۔ اب ہم ایک قوم ہیں، پاکستانی ہیں۔

ہندوؤں کے کئی خدا ہیں، وہ بھی مودی کے ہندوستان کی بجائے پاکستان کو ترجیح دیتے ہیں، ابھی ہندوؤں نے کہا کہ ناانصافیاں بند کرو ورنہ ہم مسلمان ہو جائیں گے۔ ہندوستانی زندگی کے حقائق یہ بتاتے ہیں کہ شکر ہے کہ پاکستان بن گیا۔ ان صداقتوں سے اقبال و قائد اور مسلم عوام کی پیش بینی ظاہر ہوتی ہے کہ علما کا ساتھ نہیں دیا اقبال و قائد کا ساتھ دیا۔ انفرادی علما نے ساتھ دیا، کسی سیاسی جماعت نے نہیں۔

ڈاکٹر خالد مسعود: ایسے ہی ماحول میں بات ہونی چاہیے، چاہے وہ غزنوی کا مسئلہ ہے یا ذمی کا، ہم نے ان پر تحقیق نہیں کی ہوئی، سنی سنائی باتیں ہم کر رہے ہیں۔ یہ سیاسی لوگوں کی بنائی ہوئی کہانیاں ہیں۔ یہ کہانیاں انگریزوں نے شروع کرائی تھیں، وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ ہم مغلوں سے اچھے ہیں۔ بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ غزنوی نے دو مرتبہ فقہی مسلک تبدیل کیا، وہ اسلام کے فروغ کے لیے نہیں آیا تھا، جب خلیفہ بدلا تو اس نے مذہب بھی بدلا، وہ اسماعیلیوں سے لڑنے آیا تھا بیچ میں سومنات بھی آ گیا۔

اسلامی روایت یہ ہے کہ سب سے پہلے بائبل پر تحقیق ابن حزم نے کی اور پھر سرسید کی بائبل پر کمنٹری ہے۔ صحابہ کے دو پس منظر ہیں، ایک قسم ان صحابہ کی ہے جو عیسائیت سے اسلام کی طرف آئے اور دوسرے یہودیت سے۔ طبقات ابن سعد میں ہے کہ وہ اپنی کتابیں پڑھتے تھے اور ختم پر صحابہ کو بلاتے تھے۔ جسے ہم تاریخ کے طور پر پیش کر رہے ہیں وہ تاریخ ہے بھی یا نہیں؟ ہم کہتے ہیں کہ ہندو اسلامیات نہیں پڑھا سکتا لیکن غیر مسلموں کو اخلاقیات مسلمان پڑھاتا ہے۔

پاکستان میں تعلیمِ امن

مجتبیٰ محمد راٹھور

(فاضل مقرر کی گفتگو کے نکات پہلی ورکشاپ کی کارروائی میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں)

تیسری نشست

کچھ افکار ہم نے آپ کے سامنے پیش کیے ہیں، کچھ آپ کے بھی افکار ہوں گے، اس سرگرمی میں چھے گروپ بنائے جائیں گے جو سماجی ہم آہنگی کے لیے اساتذہ کے کردار پر تجاویز دیں گے۔

پہلا گروپ

1: کالج اور سکولوں میں تعلیم ہی نہیں تربیت کی طرف بھی توجہ دی جائے۔
2: نصاب میں سماجی ہم آہنگی اور مذہبی رواداری کا مواد شامل کیا جائے۔
3: صرف نصاب تعلیم کو مکمل کرنے کی فکر کی بجائے اخلاقی اقدار کو بھی فروغ دیا جائے۔
4: نسلی و گروہی مسائل کو ہرگز نہ چھیڑا جائے۔ اگر کوئی بات آئے تو اعتدال کے ساتھ اس کا حل نکالیں تاکہ کسی کی دل آزاری نہ ہو۔
5: اساتذہ خود بھی کسی سیاسی یا مذہبی جماعت سے منسلک نہ ہوں اور طلبہ کو بھی غیر تعلیمی سرگرمیوں سے دور رہنے کا پابند بنائیں۔

دوسرا گروپ

1: اساتذہ کو تدریس کے دوران طلبہ کے خلافِ قرآن و سنت نظریے اور سوچ کو نہیں ابھارنا چاہیے۔
2: استاد کو وسیع النظر ہونا چاہیے، بصورت دیگر نقصان ہوگا۔
3: استاد کو قومی، لسانی اور مسلکی تعصب سے اٹھ کر تعمیری کردار ادا کرنا چاہیے۔

4: معلّمی شیوہ پیغمبری ہے، اس لیے استاد کو آنحضورؐ کے اخلاق سے متصف ہونا چاہیے۔

5: قرآنی نقطۂ نظر اور تعلیمات نبوی کے مطابق طلبہ کی تربیت کی جانی چاہیے۔

تیسرا گروپ

1: استاد کو دوران تدریس مذہبی وسیاسی طور پر غیر جانبدار رہنا چاہیے۔

2: طلبہ کو مثبت اور مدلل گفتگو کا عادی بنایا جائے اور خلافِ طبع امور سے صرفِ نظر کرنے کا سلیقہ سکھایا جائے۔

3: مہیا کی گئی کتاب ''تعلیمِ امن اور اسلام'' کو ضمنی طور پر زیر بحث لایا جائے۔

4: طلبا کو بھی آمادہ کیا جائے کہ وہ سیاسی وگروہی چیزوں میں نہ الجھیں۔

5: طلبہ کو نصاب تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ انہیں تحقیق کا خوگر بنایا جائے۔

چوتھا گروپ

1: استاد کو ہر قسم کے تعصّبات سے پاک ہونا چاہیے۔

2: استاد کو چاہیے کہ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی اپنے طلبہ کو شریک کرے۔

3: طلبہ کو حوصلہ اور موقع دیں کہ وہ سوال کر سکیں۔

4: استاد کو مثالی نمونہ بن کر دکھانا چاہیے۔

5: طلبہ کی منفی سوچ کی حوصلہ شکنی ہونی چاہیے۔

پانچواں گروپ

1: استاد کے لیے تمام طلبہ یکساں حیثیت رکھتے ہوں۔

2: استاد کا کردار درسگاہ تک محدود نہ ہو۔

3: استاد علم منتقل کرنے میں نصاب تک محدود نہ رہے۔

4: استاد کو معاشرے میں احترام دیا جائے تا کہ وہ اپنا کردار ادا کر سکے۔

5: استاد جدید دور کے تقاضوں کے مطابق اپنا کردار ادا کرے۔

چھٹا گروپ

1: استاد طالب علم میں اعتماد پیدا کرے۔

2: انسانی حقوق کی بنیاد پر استاد کی تربیت کی جائے۔

3: تعلیم کو مارکیٹ سے نہ جوڑیں۔

4: اللہ کے تصور کو بھی تعلیم میں شامل کیا جائے اور سورہ لقمان کی تفسیر پڑھائی جائے۔

5: استاد کو تحفظ اور مالی معاونت فراہم کی جائے۔

پاکستان کا حالیہ فکری منظر نامہ

سید ثاقب اکبر

ہم سب تعصّبات سے تنگ ہیں اور چاہتے ہیں کہ طلبہ میں مسلکی ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ ایک طریقہ ہے کہ ہم کہیں کہ اختلافات نہیں ہیں، اور دوسرا یہ کہ اختلافات ہیں اور ان کی وجوہات یہ ہیں۔ حل یہ نہیں ہے کہ ہم بات کو چھیڑیں ہی نہیں۔ ایک ساتھی نے تحفظ کی فراہمی کی بات کی، ان کا درد سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اپنے ہی معاشرے میں انہیں خطرہ ہے۔ ہم نے بڑے علما کی کلاسوں میں دیکھا ہے کہ بڑے مجتہدین سے اختلاف کرتے ہوئے ان کے ادب کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ دونوں نظریے بیان کر کے آگے بڑھ جائیں۔ طلبہ کو مدلل اور مثبت گفتگو کا عادی بنائیں۔

حالیہ فکری منظر نامہ پر نظر ڈالتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک قوم بنانے کے لیے ہر چیز میں ہم آہنگی ضروری نہیں، بعض اوقات تنوع حسن پیدا کرتا ہے اور بعض اوقات اسے برداشت کرنا پڑتا ہے۔ جیسا کہ ملک کا دفاع، اس میں سب میں ہم آہنگی ہے۔ اس وقت کے فکری منظر نامہ میں دیکھیں تو طبقاتِ تعلیم کا اختلاف ہے، اگر کوئی چیزیں مشترک ہیں بھی تو اختلافی چیزوں کا اثر زیادہ ہے۔ سیاست بھی ہماری فکر کی تشکیل میں کردار ادا کرتی ہے۔ مثلاً فاٹا کو کے پی کا حصہ ہونا چاہیے لیکن کچھ جماعتیں مخالفت کرتی ہیں، اسی طرح کالا باغ ڈیم کا نظریہ سیاست میں بکتا ہے۔ کتنے

دائرے بنتے چلے جارہے ہیں۔ذرائع ابلاغ بھی ہماری ذہن سازی کرتے ہیں۔آرا کا تعدد کوئی بری بات نہیں لیکن اس طرح کی بحث سے تشدد اور تفرق کی کیفیت بنتی ہے، ہر آدمی دوسرے کو غدارِ وطن سے کم نہیں گردانتا۔

بسنت کے مسئلے کو بعض لوگ انسانی پہلو سے، بعض اسلام کی نظر سے اور بعض امن وامان کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔ ہمارے نبیؐ نے صرف اسی رسم ورواج کو ختم کیا جو ان کے پیغام سے ٹکراتا ہو ورنہ نہیں چھیڑا۔ میں ایک شادی میں شریک تھا، گاؤں میں ڈولی اٹھانے پر اختلاف ہو گیا۔ بدعت کہنے والے شادی کی باقی تقریبات کو چھوڑ کر چلے گئے۔ایسے طرزِعمل سے ہم کیسی قوم پیدا کر رہے ہیں۔ پاکستان کا ایک کلی مسئلہ دوقومی نظریہ ہے کہ اس پر ریاست قائم ہوئی تو اسی پر آگے بڑھے گی، مسلم نظریہ جغرافیائی حدود میں نہیں سماتا، یہ صرف نظریے کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ ریاست کا رخ متعین کرنے کا مسئلہ ہے۔چین کو تائیوان کا مسئلہ تھا لیکن انہوں نے اسے ایک عرصہ تک چھیڑا ہی نہیں، ہم ستر سال سے کشمیر کے مسئلے کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔

نبیؐ نے ابتدا قولوا لا الہ الا اللہ سے کی اور انیس سال بعد پردے کا حکم دیا۔جس نے آزادی رائے میں روڑے نہیں اٹکائے بلکہ پتھر مارے۔ پچھلے دنوں ایران میں الیکشن ہوئے، رہبر نے کہا ایسی بات کرنا جس کی ضرورت ہے، میں نے دیکھا کہ تمام امیدواروں کو موضوع دیا گیا کہ اس پر آپ نے بات کرنی ہے،70 فیصد سے زیادہ لوگوں نے ووٹ دیا، ادھر پیسے دے کر بھی لوگوں کو ووٹ کے لیے بلائیں تو نہیں جاتے۔

آخری بات یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں کبھی یہ نہیں کہتا کہ اتفاق رائے پیدا ہو جائے، اختلاف کے ساتھ جینا سیکھیں۔

سوالات وجوابات

سوال: آج کی گفتگو کی روشنی میں مستقبل کی امید کیا ہے؟

جواب: ناامید نہیں ہونا، اپنا کردار ضرور ادا کریں،50 فیصد سے زیادہ لوگ اگر دلچسپی نہیں لے رہے۔آپ مایوس دلوں میں امید کی کرن پیدا کریں۔

سوال: بہت فائدہ ہوا اس ورکشاپ سے، کیا آئندہ بھی ایسی ورکشاپس ہوں گی؟

جواب: یہ بہت اچھے لوگ ہیں، میں ہمیشہ ان سے سیکھتا ہوں، یہ ایک گروہ ہے جس نے آپ کو اکٹھا کیا، اب آپ میں سے ہر فرد ایک گروہ کا کردار ادا کرے۔

سماجی ہم آہنگی اور مذہبی رواداری میں اساتذہ کا کردار

چوتھی ایک روزہ تربیتی ورکشاپ

23 مئی 2017ء، اسلام آباد

پہلی نشست

صدارت: ڈاکٹر خالد مسعود

سابق چیئرمین، اسلامی نظریاتی کونسل

مقررین:
- نصاب یا طریقۂ تدریس، غیر متوازن رویوں کا سبب کیا ہے؟

  سید ثاقب اکبر

  چیئرمین، البصیرہ ٹرسٹ، اسلام آباد
- استاد تبدیلی میں کیا کردار ادا کرسکتا ہے؟

  رشاد بخاری

  ماہر سماجیات

دوسری نشست

صدارت: خورشید ندیم

مذہبی سکالر، اینکر پرسن

مقررین:
- انتہا پسندی کیسے پھیلتی ہے؟

  ڈاکٹر خالد مسعود

  سابق چیئرمین، اسلامی نظریاتی کونسل
- نظامِ تعلیم اور مذہبی اقلیتوں کی مشکلات

  رومانہ بشیر

  ایگزیکٹو ڈائریکٹر، پیس اینڈ ڈویلپمنٹ فورم، راولپنڈی

نصاب یا طریقۂ تدریس: غیر متوازن رویوں کا سبب کیا ہے؟

سید ثاقب اکبر

ہم ایک عرصے سے یہ خیال کرتے تھے کہ دو بنیادی مسائل کی وجہ سے مدارس شدت پسندی اور فرقہ واریت کی بنیاد ہیں کیونکہ وہ فرقہ واریت کی بنیاد پر منقسم ہیں اور دوسرا ان کے نصاب کی محدودیت اور کمیوں کی وجہ سے ہے، مجھے کلام سے متعلق کتابیں پڑھنے کا موقع ملا تو دیکھا کہ ایسی باتیں دوسروں کے خلاف لکھی گئی ہیں جو حقیقت کے برعکس ہیں۔ ریسرچ اور تعامل سے چیزیں بدلتی ہیں، اس کو دیکھنے کی ضرورت تھی، فقہی مسالک زمانی اور مکانی ضروریات پر پورے نہیں اترتے۔ طلاق کے مسائل جو حنفیوں میں پائے جاتے ہیں اس کی وجہ سے بہت سے لوگوں نے عیسائیت قبول کر لی اور اب بھی مسلک تبدیل کر رہے ہیں۔ کل جو کراچی میں پروفیسر پکڑے گئے ہیں ان کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔

ع میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

مسئلہ صرف نصاب اور تدریس کا نہیں، اس سے بھی وسیع تر ہے۔ عالمی ایجنڈے کا بھی مسئلہ ہے۔ ہمارے بعض شیعہ دوستوں نے سکول شروع کیا۔ 'پ' سے 'پنجتن پاک' اور 'ذ' سے 'ذوالجناح' ہو گیا۔ اگر ایک آدمی ایک چیز پڑھے گا اور دوسرا دوسری تو دو ذہن تو بنیں گے۔ نصاب کا ایک پہلو اور بھی ہے جو اذیت ناک ہے، اور وہ یہ کہ انسان تاریخ کو بیان کرتے ہوئے اتنا تعصب ناک ہو جائے۔ ایسا نہیں ہے کہ تاریخ خون آلود نہیں لیکن کبھی ہم حقیقت پسندی کی طرف تو آئیں، اسلامی تاریخ، پاکستان کی تاریخ، ادیان کی تاریخ سب میں تعصب ہے۔

ہم نے برصغیر کی بعض شخصیات کو اس درجے پر فائز کر دیا ہے جہاں السابقون الاولون فائز ہیں، جن کے قول و فعل کو اللہ کی تائید حاصل ہے۔ ان کے آگے تو ہمارے سر جھکے ہوئے ہیں۔

سارے مضامین میں ایسی چیزیں داخل ہوگئی ہیں جو نفرت پر مبنی ہیں۔ مولانا مودودی کی مثال دوں گا، ان کے ذہن میں سوال آیا کہ اسلام عروج کی طرف تھا تو اتنا بڑا زوال کیسے آ گیا؟ اس سوال کا جواب انہوں نے صدر اسلام سے تلاش کرنے کی کوشش کی اور خلافت سے ملوکیت کی تبدیلی پر انہوں نے ایک کتاب لکھی۔ ایسا تو نہیں ہوا کہ راتوں رات خلافت ملوکیت میں تبدیل ہوگئی۔ ادب و آداب کے ساتھ بھی تاریخ کو چھیڑنا برداشت نہیں کیا گیا۔ مولانا انوار الحق نے، جو ناظم امتحانات ہیں، بتایا کہ پچھلے سال ستر ہزار لڑکیوں نے وفاق کا امتحان دیا۔ وہی ذہنیت یونیورسٹیوں میں منتقل ہوئی ہے۔ امام غزالی نے بعض واقعات پر کہا کہ یہ صحیح السند ہوں پھر بھی بیان نہ کریں، ہم نے آیات بھی منتخب کی ہوئی ہیں اور احادیث بھی، اسی سے علما بنتے ہیں اور مدرسین بھی۔ اگر وہ کمپیوٹر کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں تو وہ بھی اسی ذہن کے تحت اسے استعمال کریں گے۔ حضرت علیؓ کا قول ہے جو بولا جائے گا پہچانا جائے گا۔

ہم ایک عرصے سے کہہ رہے ہیں نصاب میں مسائل ہیں، اس کا جائزہ لیں۔ اٹھارہویں ترمیم کے بعد وفاق نے اپنے کندھوں سے تعلیم کا بوجھ اتار دیا۔ قدرت اللہ شہاب کہتے ہیں کہ ایوب نے کابینہ بنائی اور کہا کہ جو محکمہ پسند ہے سائن کریں، سب چلے گئے تو دیکھا کہ وزارتِ تعلیم پر کسی کے سائن نہیں تھے، ایک لنگڑا جا رہا تھا تو کہا اس سے کہو سائن کر دے۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ وزیرِ تعلیم جو بنائے گئے وہ میٹرک فیل تھے۔ آخر کچھ اصول ہوتے ہیں، ترجیحات ہوتی ہیں۔ صدر صاحب کچھ دلچسپی رکھتے ہیں، لیکن معلوم نہیں ان کی تجاویز پر کوئی سنجیدگی دکھائی دے گی۔ تعلیم میں قومی ترجیحات کا تعین کیا جائے اور پارلیمنٹ باقاعدہ اس کو طے کرے۔ اس کے بعد نصاب بنانے والے لوگوں کی تربیت کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم بعض اوقات بھول جاتے ہیں کہ تاریخ کے خاص موقع پر کسی فقیہ کا تین طلاقوں سے متعلق فتوی آیا۔ آپ کو اختلاف کا حق ہے، تین طلاقیں اکٹھی قرار دینے میں حضرت عمر کو خواتین کی تکلیف کا احساس تھا کہ نہ انہیں بساتے ہیں نہ چھوڑتے ہیں، انہوں نے استحصال شدہ طبقے کی دادرسی کی، آج ایک اور عمری روح کی ضرورت ہے جو دوسری طرح سے استحصال کو ختم کرے، ایک خاص موقع پر دیے گئے فتویٰ کی تعمیم کر کے ہم اس اس کا اطلاق ہر صورت حال پر کر دیتے ہیں۔ اصلاحِ احوال کے لیے معاشرے کا بہت بڑا درد چاہیے۔

میری رائے ہے کہ فرقہ والے مدارس کے پاس ڈگری نہیں ہونی چاہیے۔ جب ہم ڈیڑھ ارب مسلمان گنتے ہیں تو اس میں شیعوں اور اباضیوں کو بھی شامل کر کے فخر کرتے ہیں، مدارس میں بھی سب کو شامل کریں۔ جب ہم دوسروں کے ساتھ بیٹھیں گے اور تبادلہ خیال کریں گے تو فرق پڑے گا۔ مجھے آپ سے اختلاف کا حق ہے، یہ حق مجھے آپ کو بھی دینا چاہیے۔ جب تک حکومتی سطح پر یہ بحثیں نہیں ہوں گی یہ مسائل حل نہیں ہوں گے۔

استاد تبدیلی میں کیا کردار ادا کر سکتا ہے؟

رشاد بخاری

ثاقب اکبر صاحب کی گفتگو کے بعد ہمیں تھوڑی دیر خاموشی سے ان کے نکات پر غور کرنا چاہیے لیکن وقت کا حساب بھی رکھنا ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ وہ کون سی تبدیلی ہے ہمارے نظام تعلیم میں یا کمرہ جماعت میں جس کی ضرورت ہے؟ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے مدارس کے اساتذہ کے ساتھ بھی کافی کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ اور ہم نے ایک کتاب تیار کی جس کی پانچوں وفاقوں نے توثیق کی۔ سب سے پہلے میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ہم کیا تبدیل کرنا چاہتے ہیں؟

جواب: انسانی فطرت کی شناخت اہم ہے۔ ہمیں ریڈیکلائزیشن کو ڈی ریڈکلائزیشن سے تبدیل کرنا ہے۔

تجویز: پہلے نصاب پر بات ہوتی، پھر طریقہ تدریس پر، اور پھر ہم دیکھتے کہ کہاں غلطی ہے اور پھر اس کے حل کے لیے تجاویز آتیں۔

جواب: کچھ چیزیں ایسی ہیں جو شاید ہماری سطح پر تبدیل نہیں ہوسکتیں لیکن اس کے باوجود کچھ چیزیں ہمارے دائرہ اختیار میں بھی ہیں۔

میرے خیال میں 9 چیزیں ہیں۔ پہلا مسئلہ ابلاغ کا ہے جس کی وجہ سے تعصب اور الزام تراشی کا رجحان ہمارے اندر در آیا ہے، خیالات کی باہمی ترسیل میں ذمہ داری دوسروں پر ڈال دی جاتی ہے۔ میں کسی کو یہ تو کہہ سکتا ہوں کہ آپ کی بات سے مجھے ٹھیس پہنچی لیکن یہ کہنا کہ آپ نے بڑی بے ہودہ بات کی، غیر مہذب رویہ ہے۔ ہمیں طلبہ کو تہذیب سکھانی ہے۔ ہم نے طلبہ کو پڑھنا اور نتیجہ اخذ کرنا نہیں سکھایا، یہ ساری چیزیں زبانوں میں بھی آئیں گی اور سماجی علوم میں بھی۔ عموماً سیاق وسباق سمجھے بغیر غلط نتیجے اخذ کیے جاتے ہیں جس کی وجہ سے توازن بگڑ جاتا ہے۔

دوسری چیز سماعت ہے۔ ہم کسی کی بات پوری سنتے نہیں، درمیان سے بات کاٹ دیتے ہیں، ارون دھتی رائے کا ناول پڑھیں تو دھیان اس طرف جاتا ہے کہ چھوٹی چھوٹی چیزوں پر ہم توجہ نہیں دیتے۔ جب طعنہ دیں گے تو اس سے نفرت جنم نہیں لے گی؟ دل آزاری اور نفرت سے بچنے کی یہ مہارت ہم نے اپنے طلبہ کو بھی سکھانی ہے۔

تیسری چیز سوالات ہیں، کہ ہم سوال کیسے کرتے ہیں؟ یا سوال اٹھانے کی اجازت بھی دیتے ہیں یا نہیں۔ فرض کیا میرے ذہن میں ایک سوال ہے لیکن میں وہ کھل کر پوچھ نہیں سکتا، پھر علم کا سفر کیسے آگے بڑھے گا؟ دوسروں کے خیالات جاننے، سمجھنے اور جانچنے کے لیے سوالات اٹھائیں۔

چوتھی چیز عدم اتفاق اور اختلاف ہے۔ ہمیں یہ مہارت نہیں آتی، صرف دھڑے بندی آتی ہے۔ یہ رویے ہمارے کلاس روم، پارلیمنٹ اور جلسوں سے نکلے ہیں۔ اتفاق اور عدم اتفاق سے نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔ مسائل بہت حد تک حل ہوسکتے ہیں اگر میرے اندر یہ کشادگی آجائے کہ میں دوسروں کی اختلافی رائے کو بھی احترام دوں۔ ایک سکول وہ ہوتا ہے جہاں استاد قدم

رکھے تو اس کا دل پڑھانے کو کرے اور طالب علم قدم رکھے تو اس کا دل پڑھنے کو کرے، ایسا ماحول پیدا کیا جائے، آموزش اور تربیت صرف کلاس روم میں نہیں ہوتی۔

اگلا نکتہ یہ ہے کہ خیالات کا اظہار کیسے کیا جائے؟ عام طور پر لوگ ایک رائے قائم کر لیتے ہیں تو دوسروں کو اس سے اختلاف کی اجازت نہیں دیتے۔ مجھے دوٹوک لہجے اور رویے سے پریشانی ہوتی ہے۔ یقیناً اپنے نقطۂ نظر میں واضح ہونا بہت ضروری ہے لیکن اس تک پہنچنے میں کافی وقت لگتا ہے۔ جو آدمی حتمی انداز میں بات نہ کرے، اسے ہم پسند نہیں کرتے، لیکن دوٹوک بات کا مطلب ہے آپ نے قلم توڑ دیا، اب مزید بات نہیں ہوسکتی۔

ایک اور چیز شراکت ہے۔ ایک مجلس میں ہر رکن شریک ہو اور وہ اپنی رائے دے۔ ایک اور نکتہ تنازعات سے نمٹنے کا ہے۔ تنازعہ صرف کشمیر یا فلسطین کا نہیں ہوتا، ایک تنازعہ وہ ہے جو ہمارے گھر اور درسگاہ میں ہے، ہمیں دیکھنا چاہیے کہ معلومات کا تبادلہ کیسے کرنا ہے؟ ایک نکتہ قبولیت اور ذمہ داری کا ہے۔ عام طور پر شر کا کسی عمل کا حصہ بنے بغیر چیزوں کو قبول کر لیتے ہیں، اس سے اندھی تقلید پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح ہم ذمہ داری ہمیشہ ہم دوسروں کے کندھوں پر کیوں ڈالتے ہیں؟ حکومت پر ڈالتے ہیں یا یہ کہ ہمیں یہ کرنا چاہیے، ہم کی بجائے میں کہنا چاہیے۔ ایک لفظ ہوتا ہے ہمدردی، دوسرا ہمدِلی، ان کی درست تفہیم سے بہت سے مسائل حل ہوسکتے ہیں، ہمدلی کا مطلب کہ دوسرے کی جگہ پر کھڑے ہو کر سوچنا۔ ان چیزوں سے ہم تبدیلی کے سفر کا آغاز کر سکتے ہیں۔

سوالات وجوابات

سوال: نصاب اور مدارس کے مسلکی مسائل کے حوالے سے دیکھنا چاہیے کہ یہ سارا نصاب ستر کی دہائی تک موجود تھا لیکن یہ رویہ نہیں تھا، اور یہی نصاب آج بھی ہندوستان میں اور دیگر ملکوں میں ہے لیکن وہاں ایسا نہیں ہوا، یہ نہ نصاب کا مسئلہ ہے نہ مدارس کا، مسئلہ کچھ اور ہے۔

جواب: معلوم ہوتا ہے کہ سائل کے پاس جواب موجود ہے۔فتوے تو پرانے ہیں لیکن استعمال آج ہو رہے ہیں۔1979ء میں جو ایرانی انقلاب آیا جس نے نئے سوالات نئے مسائل اور نیا ذہن تخلیق کیا۔پھر روس افغانستان میں آیا۔گورننس اور حکومتی ترجیحات پر بات ہوتی رہتی ہے۔یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ نصاب سے بھی مسائل پیدا ہوئے ہیں۔

رائے: میرا اس کو دیکھنے کا انداز یہ ہے کہ عالمی طاقتوں نے پاکستانی معاشرے کو لڑانے کی بہت سازشیں کی ہیں لیکن ہمارا معاشرہ بہت برداشت والا ہے،اور اپنی تمام کوششوں کے باوجود وہ یہاں ناکام رہے۔خوامخواہ نصاب کو چھیڑ کر امن نہیں ہوگا،اصل مسائل کا تجزیہ کر کے امن ہوگا۔ مدارس کا کوئی مسئلہ نہیں۔

سوال: کیا ہمارے مذہبی فکری منابع میں کوئی خامی نہیں ہے؟ مثلاً ہمارے ہاں تصور جہاد ہے جسے ایک گروہ پیش کر رہا ہے،دنیا میں امامت کے تصور سے بھی وہ طاقت حاصل کرتے ہیں،کیا غلبے کے تصور کو دوبارہ سے دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے؟

جواب: بہت سے لوگ تعبیر نو کی بات کر رہے ہیں۔زمان و زمین کی تبدیلی کو ابھی تک ہم نے قبول نہیں کیا۔امت کا تصور گروہوں کی طرف منتقل ہو گیا ہے۔یہ نکتہ سمجھنے سمجھانے کی ضرورت ہے۔

رائے: تین طلاقوں پر عیسائیت قبول کرنے پر کوئی ریسرچ ہے تو بتائیں،حضرت عمر نے اسے بطور تعزیر نافذ کیا ہے اور صحابہ کا اجماع ہے۔تاریخ خون آلود ہے،چند طاقتیں خلفشار پیدا کرنے کی کوششیں کر رہی ہیں۔ہم دوسروں کے مقدسات کا احترام کریں یہ طے شدہ بات ہونی چاہیے۔

رائے: دینی مدارس کی ڈگری کو مساوی قرار دینے کی جو بات کی ہے ثاقب اکبر صاحب نے میں اس سے اتفاق کرتا ہوں اور اسی پر میں نے ایم فل کا مقالہ لکھا ہے،نصاب میں تبدیلی کی ضرورت ہے،یہ وفاق اپنے طور پر رہیں،ڈگری بھی دیں لیکن اس وقت تک ان کی ڈگری کی توثیق

نہ ہو جب تک وہ چھ ماہ یا سال کا کورس مل کر نہ کر لیں۔

رائے: دنیا میں جو انقلابات آئے، اس میں ایک بڑی وجہ غربت ہے، ہمارے پاس اسلامائزیشن نہیں ہے،غربت پہلے سے ہے۔

سوال: بخاری صاحب سے سوال ہے کہ کیا دینی مدارس،سرکاری اور نجی ادارے رواداری کے لیے کسی ایک نکتے پر جمع ہو سکتے ہیں؟

تبصرہ: ثاقب اکبر صاحب نے کہا قومی ترجیحات کے تعین کی ضرورت ہے، ہم نے جب پاکستان بنایا تھا تو ترجیحات متعین کر دی تھیں،اب ہم نے اسلام کے مطابق چلنا ہے۔

سوال: پورے پاکستان میں مجموعی طور پر پڑھا لکھا آدمی تنازعات کا بھی شکار ہے اور بدعنوانی میں بھی ملوث ہے،اَن پڑھ زیادہ تر نہیں،ایسا کیوں ہے؟

تبصرہ: تعلیم رسمی بھی ہے اور غیر رسمی بھی۔دو نظام متوازی چل رہے ہوں تو ہم تنوع تک نہیں پہنچ سکتے۔

سوال: کیا شدت پسندی کو شدت پسندی سے دور کیا جا سکتا ہے؟

سوال: اگر ہم حقیقت پسندی کو بیچ میں لائیں گے تو کیا توازن پیدا ہوگا؟

سوال: مدارس اور عصری تفاوت کو فوری ختم کرنے کے لیے ہم کیا کر سکتے ہیں؟

ثاقب اکبر کے جوابات: میں نے ڈگری ختم کرنے کی بات نہیں کی۔حقیقت پسندی کی بات آئی ہے تو حضورؐ بھی وجہ بتاتے تھے،مسائل اجتہادی ہیں۔تقدس اور اختلاف رائے دو الگ الگ چیزیں ہیں،دلیل کے مقابلے میں دلیل ہے۔دو تین سو سال بعد پیدا ہونے پر مجھے نہ ٹھکرائیں،انہوں نے بھی اپنے سے پانچ سو سال قبل والوں سے اختلاف کیا،شاہ ولی اللہ کا درجہ ان سے پہلے پیدا ہونے والے کئی آئمہ سے بلند ہے۔میں بے احترامی کا نہیں کہہ رہا۔بعض سوالوں یا تبصروں کی میں تائید ہی کروں گا۔یونیورسٹیوں میں بھی انتہا پسندی آئی ہے،ایک وجہ مدارس بھی ہیں۔دو تعلیمی نظام اور فکری نہج ہی الگ ہو جانا بھی مسئلہ ہے۔ہم نے لباس کو بھی مذہبی بنا لیا ہے۔امریکہ 110 ارب ڈالر کا اسلحہ کس پر چلانے کے لیے فروخت کر رہا ہے؟ نصاب اور

استادوالی بات کی بھی میں تائید کرتا ہوں۔

رشاد بخاری کے جوابات: تعلیم بذات خود یہ ہے کہ ہم اپنی نسل کو ایک خاص نہج پر چلانا چاہتے ہیں۔طریقہ تدریس تو کوئی بتایا ہی نہیں جاتا، مجھے اس بات پر تشویش ہے کہ ہمارے نصاب میں سب کچھ ٹھیک نہیں،ہم نے پہلی سے دسویں تک اقلیتوں کے بارے میں پڑھائے جانے والے مواد پر تحقیق کی تھی،نتائج اچھے نہیں تھے، ہم طریقہ تدریس سے بھی نصاب کی کمزوری کو دور کر سکتے ہیں۔

ہم نے مدارس کے علاوہ یونیورسٹیوں میں بھی کام کیے۔یونیورسٹی کے تعاون کے ساتھ مدارس اساتذہ کا چھ ہفتوں کا تربیتی کورس کیا۔بعض حوالوں سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔بعض فرق ہیں کہ شیخ الحدیث بھی جب کلاس میں بیٹھتا ہے تو وہ سر جھکا کر سیکھنے کے لیے بیٹھتا ہے،لیکن دوسری طرف حد سے زیادہ تقدس سوچنے میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ الجھاؤ ہر جگہ موجود ہے۔ پڑھے لکھے لوگ ہی کیوں الجھاؤ کا شکار ہیں۔ یقیناً تعلیم میں ہی خرابی ہے۔اپنی ذمہ داری سے فرار ہی مسائل کی جڑ ہے۔

صدر مجلس ڈاکٹر خالد مسعود: مجھے تبلیغی جماعت میں جانے کا موقع ملا،مسجد میں گئے تو کہتے تھے کہ سب ڈنڈے سے ٹھیک ہوگا لیکن تبلیغ والے کہتے تھے کہ نرمی سے بات کو سمجھایا جائے۔امام ابوحنیفہ چالیس شاگردوں کی بات سنتے تھے،اس کی کوشش کرنی چاہیے کہ اختلاف اتفاق کی طرف جائے لیکن اس ڈر سے کہ اتفاق نہیں ہوگا اختلاف بھی نہ چھوڑیں۔

دوسری نشست

انتہا پسندی کیسے پھیلتی ہے؟

ڈاکٹر خالد مسعود

اکسٹریم ازم انگریزی میں یہ ہے کہ ایک خط مستقیم ہے جس کے ایک سرے پر آپ کھڑے

ہوں، ہمارے ہاں افراط وتفریط کا لفظ استعمال ہوتا ہے جو اس سے ذرا مختلف ہے۔دوسرا لفظ جو عربی سے آیا وہ ہے تطرف،اس میں انتہا پسندی کا معنی بھی ہے۔ ہماری اسلامی روایت میں ایک لفظ اور بھی ہے جس کی طرف ہماری توجہ جانی چاہیے اور وہ ہے غلو فی الدین،قرآن نے اس سے بار بار منع کیا۔ ہمارا اصل مسئلہ غلو فی الدین ہے،اس کا سادہ معنی یہ ہے کہ جو چیز دین میں نہیں اسے شامل کرنا اور جو ہے اسے خارج کرنا۔ ہم کہتے ہیں ہر چیز دین ہے۔غلو فی الدین کی بحث اس طرف بھی اشارہ کرتی ہے کہ ہر چیز کو آپ دین بنا دیں۔

بدعت ہر نئی چیز کو نہیں کہتے، بلکہ کسی بھی چیز کو دین کا درجہ دے کر اس میں شامل کرنا۔اب مسئلہ یہ ہے کہ آپ کی ایک رائے ہے جسے آپ عقیدے میں شامل کر دیتے ہیں اور جب عقیدہ نظریہ بن جاتا ہے اور اس کے ساتھ قوت نافذہ شامل کر دیتے ہیں کہ اس ذریعہ سے آپ اقتدار حاصل کرنا چاہتے ہیں، غلبے کی نفسیات یہیں سے پیدا ہوتی ہے۔اسلامی روایت میں رسول اللہؐ کی حضرت معاذؓ سے منقول روایت کہ حضور انہیں گورنر بنا کر بھیجتے ہوئے پوچھتے ہیں کہ کیسے فیصلہ کریں گے؟ آپ جواب میں کہتے ہیں: میں قرآن سے فیصلہ کروں گا۔ پوچھا اگر قرآن میں نہ پاؤ؟ جواب دیا آپ کی سنت واسوہ میں تلاش کروں گا۔اس پر بھی وہی سوال کہ سنت میں بھی نہ ملے تو؟ اس میں تربیت یہ دی جا رہی ہے کہ سوالات کہیں زیادہ ہیں۔آپ میں یہ اہلیت ہونی چاہیے کہ وحی کے ابدی اصولوں سے مسائل کو حل کریں۔

یہ ہماری اسلامی روایت کا بنیادی عمل ہے،مسائل ہمارے علم سے زیادہ ہوں گے۔حل ایک رائے سے اور تعبیر سے ہوگا اور اختلاف لازمی ہوگا۔آپ اختلاف کو روکیں گے؟نہیں۔شروع سے ہی اختلاف رائے کو اجاگر کیا گیا۔اور آپ نے بتایا کہ لڑائی سے نہیں دلیل سے حل کرنا ہے۔ وجادلھم بالتی ھی احسن۔ رسول اللہؐ کا اسوہ یہ ہے کہ جنگ مقصد نہیں،مقصد صلح ہے۔آپ مختلف علاقوں میں گئے،قبائل سے بات کی،مدینہ میں بھی تشریف لائے تو باقاعدہ معاہدے کیے۔ رسول اللہؐ کا طریقہ یہ نہیں کہ جنگ کر کے علاقوں پر قبضہ کریں۔

عباسی خلافت امویوں کے مقابلے میں اسلامائزیشن تھی، انہوں نے امت کو اکٹھا کرنے کی کوشش کی، خلیفہ منصور امام مالک کے پاس گئے کہ میں آپ کے جمع کردہ ذخیرہ احادیث وآثار موطا کو قانون کے طور پر نافذ کرنا چاہتا ہوں، امام نے سختی سے منع کیا، کہا جس طرح میں نے یہاں جمع کیں اسی طرح دوسرے علاقوں میں بھی صحابہ کی آراء جمع کی گئی ہیں، میں اپنی رائے مسلط نہیں کرنا چاہتا۔

غلو فی الدین سے روکا گیا ہے۔ دین سے مراد وہ ہے جس میں انسان کے تجربے کو دخل نہیں، آخرت سے تعلق ہے۔ دین کی کسی چیز میں مبالغہ کرلیا جائے تو یہ غلو کہلاتا ہے۔ تفرقہ اور تکفیر کی بنیاد عموماً غلو فی الدین ہی ہوتی ہے، تمام کتابوں میں یہ ہے کہ تکفیر کے مسئلہ میں تحقیق کے بعد یہ تو کہہ سکتے ہیں جو اس کا قائل ہو وہ کافر ہے لیکن کسی گروہ کی تکفیر نہیں کی جاسکتی۔

دور جدید میں دو چیزیں آئیں، سب سے بڑا دھچکا اٹھارہویں صدی میں لگا، علما نے کہا ہم سنت سے دور چلے گئے۔ زیادہ تر افریقہ میں اصلاح کی تحریکیں چلیں۔ اس کے آخر میں نوآبادیاتی دور شروع ہوگیا۔ اس کے بعد ہمارا خود احتسابی کا عمل رک گیا کہ ہم اپنی ریاستیں قائم کریں، پھر کچھ ریاستی نظریات آئے جس میں شریعہ کے نفاذ کا نظریہ بھی تھا۔ جس نے ایسا نقطہ نظر دیا کہ اس کے بغیر مسلمان قائم نہیں رہ سکتے۔ ان تحریکوں کی بنیاد یہ تھی کہ غیر اقوام نے ہم پر تسلط قائم کرلیا۔ اس میں تشدد کو بھی لازمی سمجھ لیا گیا۔ ہوا یہ کہ ان کو تو صحیح نہ کر پائے لیکن خود کمزور ہوگئے۔

سوالات

سوال: روزے کے تصور کا مقصد ہے کہ امراء کو بھی غریبوں کا احساس ہوجائے، ہم فاٹا والوں کو تنازعات اور اسباب کا زیادہ پتا ہے۔ ایک ہے اندر سے برائیوں کا خاتمہ اور دوسرا معاشرتی برائیوں کا خاتمہ، یہ پوری دنیا میں ہورہا ہے۔ حضورؐ کے زمانے میں وہ کیا طریقہ کار تھا جس نے وحشی اور سلمان فارسی سے تنازعے کو ختم کیا؟

سوال: جب عقیدے کی بنیاد پر ہم سماجی اور ریاستی نظام قائم کرتے ہیں تو کیا وہ تنقید کے دائرے میں آئے گا؟

سوال: ہجرت کے موقع کی آیت ہے: ان الذی فرض علیك القرآن لرادك الی معاد اور هو الذی ارسل رسوله بالهدی و دین الحق لیظهره علی الدین کله۔ اس میں ہماری دینی پوزیشن کیا ہوگی؟ دوسرا یہ کہ اخلاقیات ومعاملات سب کو ہم عقیدے تک کیسے محدود کرسکتے ہیں؟

سوال: انتہا پسندی کو صرف مذہب کے ساتھ کیوں جوڑا جارہا ہے؟ بلوچستان میں جو ہورہا ہے کچھ لوگ اسے اچھا سمجھتے ہیں۔

نظام تعلیم میں اقلیتوں کی مشکلات

رومانہ بشیر

(رومانہ بشیر صاحبہ کی گفتگو تیسری ورکشاپ کی تفصیلی روداد میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے)

سماجی ہم آہنگی اور مذہبی رواداری میں اساتذہ کا کردار

پانچویں اور چھٹی ایک ایک روزہ تربیتی ورکشاپ

18، 19 جولائی 2017ء، کراچی

پہلی نشست

صدارت: غازی صلاح الدین

سینئر صحافی

ابتدائی کلمات:

- محمد عامر رانا

ڈائریکٹر، پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز

- محمد اسماعیل خان

پراجیکٹ منیجر، پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز

مقررین:

- عمومی رویّوں میں عدم برداشت

خورشید ندیم

مذہبی سکالر، اینکر پرسن

- نصاب یا استاد: عدم برداشت کی وجہ

ڈاکٹر سید جعفر احمد

سابقہ ڈائریکٹر، پاکستان سٹڈی سنٹر، کراچی یونیورسٹی

دوسری نشست

صدارت: غازی صلاح الدین

سینئر صحافی

مقررین:

- پاکستان کا فکری چیلنج

ڈاکٹر خالد مسعود

سابق چیئرمین، اسلامی نظریاتی کونسل

- پاکستان میں غیر مسلموں کے مسائل

رومانہ بشیر

ایگزیکٹو ڈائریکٹر، پیس اینڈ ڈویلپمنٹ فورم، راولپنڈی

- استاد کا کردار برائے تبدیلی

سید احمد بنوری

مذہبی سکالر

تیسری نشست

صدارت: غازی صلاح الدین

سینئر صحافی

مقررین:

- پاکستان کا نظامِ تعلیم اور سماجی ہم آہنگی کی راہ میں حائل رکاوٹیں

ڈاکٹر خالدہ غوث

منیجنگ ڈائریکٹر، سوشل پالیسی اور ڈویلپمنٹ سینٹر، کراچی

- سماجی میڈیا اور سماجی ہم آہنگی

سبوخ سید

سینئر صحافی، تجزیہ نگار

- سماجی رویّوں کی تشکیل میں میڈیا کا کردار

مبشر زیدی

سینئر صحافی، تجزیہ نگار

پہلی نشست

پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز کے زیر اہتمام 18 اور 19 جولائی کو کراچی میں ''سماجی ہم آہنگی میں اساتذہ کا کردار'' کے عنوان سے دو ورکشاپس منعقد ہوئیں۔ افتتاحی کلمات میں ورکشاپ کا پس منظر اور ادارے کا تعارف پیش کیا گیا جس کے بعد معزز سکالرز نے طے شدہ موضوعات پر مفصل گفتگو کی۔ پہلی نشست کے مقررین کی گفتگو گزشتہ ورکشاپس کی روداد میں گزر چکی ہے، اس لیے تکرار کی بجائے اس گفتگو کے نتیجے میں اٹھنے والے سوالات اور ان کے جوابات سے آغاز کیا جاتا ہے۔

1۔ فکری اور مذہبی انداز سے ہم نے جو تحریکیں چلائیں، افریقہ اور وسطی افریقہ اور سوڈان کی تحریک تو اب تک وہاں کے لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ جب تک مہدی علیہ السلام کا نام استعمال نہ ہو تو کوئی بھی تحریک کامیاب نہیں ہوسکتی۔ مہدی سوڈانی کے نام سے ساری تحریکیں چلی ہیں۔ پچپن اسلامی ممالک میں مذہبی بنیاد پر ہم نے اپنا قانون بنایا، مذہبی بنیاد پر ہم نے انہیں مذہبی ریاستیں قرار دیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ کیا اسلامی فلاحی ریاست کہیں دنیا میں قائم ہوسکی؟ جب تک ہمارے قانون میں مذہب کو قانون کا حصہ بنا کر اس میں جوشق ڈالی جاتی ہے کہ صدر اور وزیر اعظم سے لے کر جتنے بھی مقتدر وزارتیں ہیں، صرف مسلمانوں کی ہوں گی تو ترقی کرنا ممکن نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جب ہم یہ بات کر رہے ہیں، گارڈن ڈون کے الفاظ یہ تھے کہ مجھے نظر آرہا ہے کہ آئندہ برطانیہ کا وزیر اعظم کوئی ایشیائی ہوگا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ معاشرے میں جو ہم آہنگی ہے اس میں ریاست مداخلت نہ کرے۔ ریاست اپنا الگ اور مذہب اپنا الگ کام جب تک نہیں کرے گا، پاکستان کا یہ خطہ ترقی بھی نہیں کرسکے گا۔

2۔ پنجاب میں ہم نے دیکھا ہے کہ غیر مسلم کمیونٹی کے ساتھ ناانصافی ہوتی ہے۔ توہینِ رسالت کے نام سے کوئی نہ کوئی جھوٹا الزام لگا دیا جاتا ہے کہ تم نے قرآن جلا دیا، تم نے یہ کیا، یہ کہا۔ یہ ایک علاقے میں ایک قسم کی ناانصافی ہے۔ دوسرے علاقے میں دوسری قسم کی ناانصافی ہے۔ ہمارے

ہاں سندھ میں توہینِ رسالت کے نام سے آج تک کوئی ایسا کیس نہیں ہوا۔ باقی صوبوں کا مجھے نہیں معلوم۔ یہ جو مختلف سلوک ہیں ایک ہی کمیونٹی کے ساتھ یہ کیوں ہے؟ کیا کوئی علاقائی فرق ہے۔ یعنی یہ اختلاف کیوں ہے؟

3۔ قائداعظم کی پاکستان بننے کے بعد کی جو ایک سالہ تقریریں ہیں ان کو بھی دیکھ لیں۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرے کے مختلف گروہوں نے اپنے اپنے مفاد کی خاطر اس کے کچھ خاص حصے کو حوالے کے لیے نقل کیا ہے۔ جن کا اپنا مفاد یا اپنی پالیسی 11 اگست کی تقریر میں ہے وہ اس چیز کا زیادہ حوالہ دیتے ہیں اور جو اسلام پسند لوگ ہیں یا اسلامی نظریہ کی بات کرتے ہیں وہ قائداعظم کے دیگر بیانات کا حوالہ دیتے ہیں کہ فلاں موقع پر یہ کیا، فلاں موقع پر یہ کہا۔ تو یہ الجھن بھی یہاں سے پیدا ہوتی ہے۔ بحیثیت مجموعی ہم کسی ایک شخص کی بات کو سیاق وسباق سے الگ نہیں کرسکتے۔ پوری زندگی کی باتوں کو دیکھ کر ایک مجموعی نتیجہ نکال سکتے ہیں۔ اس حوالے سے کچھ بات ہوجائے۔

جوابات

غازی صلاح الدین

1۔ ایک بات تو یہ ہے کہ یہ جو صوبائی خودمختاری اور معیشت کی باتیں ہوتی ہیں اگر بلوچستان کے ساتھ ناانصافی ہورہی ہے تو وہ اپنی جگہ قابل غور ہے اس پر بات بھی ہونی چاہیے لیکن مذہبی مسائل اور تنازعات کی حیثیت تھوڑی سی مختلف ہے۔ دوسرے ایک یہ سوال آیا تھا کہ غیر مسلموں کے ساتھ جو سلوک پاکستان میں ہوتا ہے، کیا ایسا سلوک مسلمانوں کے ساتھ دوسرے معاشروں میں ہوتا ہے۔ اس کا جواب آیا تھا ''نہیں''۔ کچھ ملک ہیں اگر آپ کا اشارہ انڈیا کی طرف ہے۔ ہماری طرح کے ایسے ملک ہیں جہاں امتیاز برتا جاتا ہے۔ میانمار کی تو ایک چھوٹی سی کہانی ہے۔ دیکھیں جہاں جمہوریت ہوتی ہے، انسانی حقوق کا پاس کیا جاتا ہے، ان معاشروں میں مختلف مذاہب کے مختلف قومیتوں کے لوگوں کو برابر کا شہری کیسے مانا جاتا ہے۔ اس کی اتنی سادہ سامنے کی مثالیں

موجود ہیں، صادق خان ایک مسلمان پاکستانی نژاد ایک بس ڈرائیور کا بیٹا لندن کا میئر منتخب ہوا ہے۔ ووٹوں کے ذریعے لندن کے شہریوں نے اسے اپنا میئر منتخب کیا ہے۔ اور جو بات ہو رہی تھی حلف لینے کی کل رومانہ صاحبہ نے مثال بھی دی تھی کہ جب صادق خان اس سے پہلے کابینہ کے وزیر بنے تھے۔ کابینہ کے وزیر بائبل پر حلف لیتے ہیں لیکن صادق خان اس حلف برداری کی تقریب میں قرآن شریف لے کے گئے اور انہوں نے کہا میں تو اس پر حلف لوں گا اور انہوں نے قرآن شریف پر حلف لیا اور جب وہ حلف لے چکے اور جب کوئی ان کا قرآن شریف واپس کرنے آیا۔ انہوں نے کہا کہ لیجیے ہوسکتا ہے کہ اس کی پھر ضرورت پڑے۔ جمہوری معاشرے میں ان کی مثال دیکھیں، ہم جو کہتے ہیں کہ مغرب کے بارے میں ہمارے رائے ایسی رہتی ہے، لیکن ان معاشروں نے ہم آہنگی کو ثابت کیا ہے۔ کینیڈا کو دیکھ لیں وہاں سکھ اور مسلمان اور ہندو وزیر بنتے ہیں تو ہم جو سلوک کرتے ہیں غیر مسلموں کے ساتھ وہ واقعی ہمیں مہذب ملکوں کی فہرست میں بہت نیچے رکھتا ہے۔ یہ بات سوچنے کی ہے اور اس کی مثالیں موجود ہیں۔ اور اب میں ڈاکٹر صاحب سے کہوں گا کہ اپنے متعلقہ سوالوں کے جوابات دیں۔

ڈاکٹر خالد مسعود

سب سوالوں کا جواب تو ممکن نہیں لیکن کچھ سوال ایسے ہیں جو سب میں مشترک ہیں، ان پر کچھ بات کرتے ہیں۔ ایک بڑا زبردست سوال ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل کا وہ فیصلہ کہ نابالغ کا اسلام بھی قبول ہے۔ اول تو اسلامی نظریاتی کونسل کوئی فیصلہ نہیں کرسکتی، اس کے پاس تو کوئی اختیار ہی نہیں ہے۔ انہوں نے سفارش کی ہے، اس لیے قانون بنایا جائے گا۔ لیکن اسلامی نظریاتی کونسل کا مسئلہ ہے کہ حکومت جسے نابالغ کہتی ہے وہ اسے نابالغ نہیں مانتے۔ نکاح کے ضمن میں مسلمانوں کے معاملے میں کہ تیرہ سال کی بچی جو مسلمان ہے، اس کا نکاح ہوسکتا ہے۔ لیکن جو اسلامی روایت اور شریعت ہے، وہ یہ ہے کہ چاہے بالغ ہے یا نابالغ زبردستی کسی کو اسلام قبول نہیں کروایا جاسکتا۔

اسلامی نظریاتی کونسل میں بھی علماء بیٹھے ہوتے ہیں تو انہوں نے مسئلہ یہ نہیں کہا کہ نابالغ کا اسلام قبول ہے، انہوں نے مسئلہ بڑے طریقے سے کہا ہے کہ جو ایک دفعہ اسلام قبول کرچکی ہے یہ نہیں کیا جاسکتا کہ اب وہ اسلام چھوڑ دے، تو انہوں نے مسئلہ کو دوسری طرح لیا ہے۔ بہرحال بنیادی سوال یہ ہے کہ اسلام کے حوالے سے کبھی بھی کسی نے بات نہیں کی کہ اسلام کسی کو زبردستی قبول کروایا جاسکے۔ ہم کو بھی سوچنا چاہیے کہ ہم نے کب قبولِ اسلام کیا۔ ہم پیدائشی بہت سارے ہیں تو کبھی یہ موقع آنا چاہیے جس پر میں بھی اسلام قبول کرتا ہوں۔ سوال ایک اور بھی ہے وہ بھی زیر بحث ہے۔ وہ یہ ہے کہ غیر مسلم کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے کہ نہیں۔ اس پر ہماری فقہ میں بہت بحث ہوچکی ہے اور اس میں وہ کہتے ہیں بس زکوٰۃ ایک اسلامی فریضہ ہے۔ جیسے نماز ہے غیر مسلم پر نماز فرض نہیں۔ یہ زکوٰۃ اس کے اوپر نہ فرض ہے نہ اس پر ادا کی جاسکتی ہے لیکن میرے خیال میں اس پہ اجتہاد کی ضرورت ہے کیونکہ قرآن کریم میں جو الفاظ ہیں اس میں غیر مسلم کی قید نہیں ہے۔ مسکین، غریب، فی سبیل اللہ یہ جو مصارف ہیں اس میں مسلم ریاست کے تمام شہری شامل ہیں۔ صوبائی اقلیتوں والا، دوسری اقلیتوں والا، پاکستان کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ بنیادی معاملاتِ حکومت جس میں پاکستان میں تمام شہریوں کو بنیادی حقوق اور ضروریات ملنی چاہئیں، اس میں ہم نے سوال اٹھائے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ مسائل جو دراصل لسانی یا صوبائی تھے ان کی جگہ اسلام کو مسئلہ بنایا گیا، اور علماء کو بلایا اور ان سے مسئلہ حل کروانے کی کوشش کی۔ ہم نے یہ کہا کہ دراصل یہ حکومت کے بنیادی انتظامی مسائل ہیں جس میں اسلام کی اور غیر مسلم کی تفریق کیے بغیر ان سب کو وہ سہولتیں ملنی چاہیے جو اسلام کی اور اسلامی سیاسی نظام کی روح ہے۔ اس کی بجائے اس کو سیاسی مسئلہ بنایا گیا۔ اصل مسئلہ جو بہت غور طلب اور شدید تر ہوتا جارہا ہے، یہ ہے کہ ہم نے تجربہ کرکے دیکھ لیا ہے۔ یہ بات میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت تمام مسلم ریاستیں جو او آئی سی کی ممبر ہیں سب کے ہاں اسلام ریاستی مذہب نہیں ہے۔ جو ہمارا تجربہ ہے تمام مسلم ریاستوں میں اس جدید دور میں ہم نے دیکھا ہے کہ ریاست کا مذہب اسلام بنانے سے نہ تو ریاست کو فائدہ ہوا نہ

مذہب کو فائدہ ہوا۔ اس تجربہ کی روشنی میں اس معاملے کو دیکھنا چاہیے۔ اگرچہ یہ بات کہتے ہوئے بہت سے اندیشے بھی ہوتے ہیں کہ اس سے غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے۔

عباسی دور سے لے کر ہمارے زمانے تک علماء نے اور اسلامی سیاسی نظام میں بادشاہ اور شریعت کے درمیان ایک حد بندی مان لی تھی۔ اور اس کے لئے لفظ ''سیاسہ'' ہے جس کے تحت اگر بادشاہ سمجھتا ہے کہ اگر ریاست، عوام یا تمام امت کا فائدہ ہے تو وہ کوئی ایسا سزا دے سکتا ہے جو حد کی سزا ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں بھی اس میں بحث ہے۔ دوسرا یہ کہ اس میں بہت سی چیزیں ہیں کہ سیاست کہ تحت جو کام ہوگا اس میں شریعت دخل نہیں دے گی۔ مثلاً جو مظالم کی ریاستیں تھیں، جو بادشاہوں کی عدالتیں تھیں، جو حکومت کے کارندے تھے، ان کے خلاف اگر کوئی شکایتیں ہوں تو اس کے لیے الگ سے عدالتیں تھیں۔ ان عدالتوں میں قاضی کو ضروری نہیں تھا کہ جو شریعت کی شرائط ہیں یہ شہادت وغیرہ کی ان پر عمل کرے، ان کے لیے بالکل دوسرا طریق کار ہوتا تھا۔ اگلی بات شریعت کے دائرہ کار کی ہے۔ اگر آپ اسلامی سیاسی نظام اور فتاویٰ کی کتابیں دیکھیں تو اس میں بادشاہ کے اختیارات میں بہت سی چیزیں ایسی تھیں جس میں وہ شریعت کے احکام کے بارے میں قاضی پر پابندی لگا سکتا تھا کہ یہ اس میں آپ نہیں کریں گے اور وہ بہت سی ایسی سزائیں، بہت سے ایسے حکم دے سکتا تھا جو نظریہ فقہ اور شریعت کے خلاف ہیں۔ مختصر یہ کہ سیاست کا تقاضا مختلف ہے۔ اگر آپ دیکھیں گے ''نظریات سیاسیہ'' اس میں کتابیں بھی بہت سی ہیں۔ وہ یہ نظریہ دیتے ہیں کہ اگرچہ دین اور دولت ایک ہیں لیکن دولت کے دائرہ کار اور شریعت کے دائرہ کار میں ایک حد بندی ہے۔ اور اسی کی وجہ سے جو فقہ تشکیل پاتی ہے، آپ اہلِ علم ہیں میں صرف نکتے کے لیے بات کرتا ہوں، حدود صرف پانچ جرائم یا زیادہ سے زیادہ سات جرائم کی بات کرتی ہے۔ لیکن باقی سارے جرائم پر فقہ خاموش ہے۔ حدود کے علاوہ جو سزائیں ہیں ان کا نام تعزیر رکھا گیا ہے۔ تعزیر کے لیے فقہ کی کتابوں میں سزائیں نہیں دی ہوتیں۔

ان کی شرائط کیا ہوں گی، یہ قاضی کی صوابدید پر رکھا گیا ہے اور قاضی ہمیشہ خلیفہ اور گورنر کا

ماتحت ہوتا ہے۔ وہ شریعت کے احکام کا اس لیے پابند ہوتا ہے کہ وہ شریعت کے فیصلے دیتا ہے لیکن نمائندہ وہ اہلِ مذہب کا نہیں ہوتا، وہ ریاست کا نمائندہ ہوتا ہے۔ تو یہ جو فرق ہیں یہ سارے کہ سارے اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ اس وقت بھی حکومتیں کامیاب ہوئیں تو اس لئے ہوئیں کہ انہوں نے اس میں ایک حد بندی کی تھی۔

اب علامہ اقبال پہ آجائیں۔ علامہ اقبال نے یہ کہا کہ سیکولرزم اور مذہب کی جو جدید دور میں بحثیں ہوئی ہیں وہ اصل میں صحیح طور پر ہم سمجھ نہیں سکے۔ جدید دور میں سیکولرزم کا معنی یہ ہے کہ بنیادی طور پر جو چیزیں عوامی ہیں اور جو ریاستی امور ہیں اس میں مذہب کا عمل دخل نہیں ہوگا۔ اس میں جو ہماری اسلامی روایت یہ ہے کہ امورِ سلطنت اور مقاصدِ سلطنت میں کچھ چیزیں بادشاہ یا خلیفہ قاضی اور مفتی سے زیادہ بہتر جانتا ہے۔ اس لیے اس کی رائے کو ایک درجہ ترجیح دی گئی ہے۔ لہٰذا اس امر پر غور کرنے کی ضرورت ہے اور جدید دور میں خاص طور پر ہم نے دیکھا ہے کہ نیشن اسٹیٹ، جدید ریاست اور پرانے اسلامی ریاست کے تصور کی تفہیم میں مشکلات پیش آرہی ہیں۔

ان مشکلات کی بھی ایک بڑی وجہ ہے جو آج کہہ دیتا ہوں کہ جو جدید دور سے پہلے کی 'اسلامک پولیٹیکل تھیوری' ہے وہ بھی ہو بہو وہ نہیں ہے جو اس وقت ہم اسلامی ریاستی نظام کے طور پر پیش کررہے ہیں۔ یہ اسلامی ریاست کی تعریف کی ہے۔ یہ اس وقت کی تیار کردہ ہے۔ اس تصورِ ریاست نے اسلامی ریاست کو اس لحاظ سے دیکھا ہے۔ اس لحاظ سے آپ چاہتے ہیں کہ ریاست کی حدود اور اس کے اختیارات کو کم کیا جائے۔ لیکن اسلامی سیاسی نظام میں بادشاہ کی حدود شریعت میں موجود ہیں، لیکن بادشاہ کو وہ اختیار کبھی نہیں دیتے جو آج کی جدید ریاست کا ہے۔ ان بحثوں کی روشنی میں ہم یہ دیکھ سکتے ہیں کہ ہماری روایت میں ریاست اور مذہب کے دائرہ کار میں جو فرق تسلیم کیا گیا ہے، اس کو ہم اجاگر کرسکتے ہیں۔ اس وقت جو سب سے بڑی مثال سامنے آتی ہے اور ظاہر ہے اس کا مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے، وہ یہ کہ تیونس میں جیسے یہاں جماعت اسلامی ہے وہاں ''النھضہ'' تھی۔ راشد غنوشی ان کے سربراہ ہیں تو ان کا بالکل اسی اخوان اور جماعت اسلامی

کی طرح اسلامی ریاست کا تصور تھا۔انہوں نے دورِ حاضر میں آ کے یہ کہا ہے کہ اسلام کی سیاسی فکر میں سیکولرزم کے تصور کو لانا پڑے گا، ورنہ اسلامی ریاست کامیاب نہیں ہوگی۔

رومانہ بشیر

ایک سوال مذہبی اور اقلیتی امور کی وزارت کے حوالے سے تھا کہ یہ ایک ہی کیوں ہیں؟ تو میں تو یہ کہتی ہوں کہ یہ ہیں ہی کیوں؟ اس لیے کہ قائداعظم کے دور میں تو یہ کوئی وزارت نہیں تھی۔تو اس وزارت میں کیا ہوتا ہے، اس پر بہت سے سوالات ہیں۔تو میں تو یہ سوچتی ہوں کہ نہیں ہونی چاہیے۔کم عمری کی شادی کی بات ہوگئی ہے، دوسروں ملکوں میں رہنے والی اقلیتوں کے حوالے سے، ان کے حقوق کے حوالے سے بھی بات ہوگئی ہے۔میں صرف اس میں عاجزی اور انکساری کے ساتھ چھوٹا سا اضافہ یہ کرتی چلوں کہ میں نے اپنی گفتگو میں بھی یہ کہا تھا کہ جب بھی یہاں کے غیر مسلم پاکستانی اپنے حقوق کی بات کرتے ہیں تو جلدی سے ان پر سوال تھوپا جاتا ہے کہ فلاں جگہ کی حقیقت بتائیں، فلاں جگہ کی حقیقت بتائیں۔دیکھیں اگر انڈیا میں بھی وہاں کی اقلیتوں کے ساتھ کوئی زیادتی ہوتی ہے تو کیا ہم اپنی اقلیتوں سے اس کا سوال کریں۔وہ تو اس کی ذمہ داری نہیں ہے اگر کہیں زیادتی بھی ہوتی ہے تو ویسے زیادہ تر تصویر ٹھیک ہے۔اور اگر وہاں ہوتی ہے تو ازراہِ کرم اپنے لوگوں سے سوال کرنے اور اپنے ہی لوگوں سے بدلہ لینے کی کوشش ہم کیوں کریں۔ وہ ہمارے لوگ ہیں، ہمیں اپنا گھر بھی ٹھیک کرنا ہے اور جو سوال پڑے ہیں ان کا جواب سوچنے کی کوشش کرنی ہے۔ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے لوگوں کو غیروں سے بریکٹ کر کے نہ دیکھیں۔دوسرا یہ کہ تحریک پاکستان میں غیر مسلم کمیونٹی کی طرف سے جو ساتھ دینے، حصہ لینے اور تحریک کو مضبوط کرنے کی بات تھی وہ یہی ہے کہ شاید ان کہ ہاں یہ احساس واقعی تھا کہ جو آج اقلیت ہیں اور اقلیت کے حقوق کو سلب ہوتا دیکھ رہے ہیں اور اقلیتوں کے حقوق کی آواز بلند کر رہے ہیں، کل جب یہ اکثریت ہوں گے تو اقلیت کے دکھوں کو حقیقی طور پر جانتے سمجھتے ہوں گے اور ان کو کم کرنے کے

لیے اپنا ہاتھ بڑھائیں گے۔

میں اتنا ہی کہوں تو میرا خیال ہے کہ کافی ہے کہ کل کی اقلیت آج کی اکثریت، تو یہ دکھ ان کے لئے نئے ہیں، وہ سمجھتے ہیں وہ ان کے لئے ضروری ہیں۔پنجاب میں مسیحی کمیونٹی زیادہ ہے، اس لیے ان کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔ابھی ایک کیس ہے، اس کا نام ثناء جان ہے۔دو پرائمری اسکول کی بچیاں ہیں، دونوں بہنیں اسکول جا رہی تھیں اور ایک بہن کو اغوا کر لیا گیا، دوسری اتنی ہوش میں ہے اتنی سمجھدار ہے کہ اس نے گھر جا کہ یہ بھی بتایا کہ میری بہن کو کس کس نے اغوا کیا ہے۔

یہ واقعہ 2015 کا ہے اور آج تک وہ بازیاب نہیں ہو سکی۔جب ہم نے نیشنل کمیشن کے آگے یہ کیس بھی رکھا تو انہوں نے کہا 2015ء؟ آج تو 2017ء ہے، اب تک تو اس لڑکی کے بچے بھی ہو چکے ہوں گے، تو آپ بڑا برا کر رہے ہیں جو اس معاملے کو اٹھا رہے ہیں۔بڑی دور تک معاملہ خراب ہو جائے گا۔ایک رپورٹ کے مطابق تقریباً ایک ہزار غیر مسلم بچیاں ہر سال اغوا ہو رہی ہیں۔یہ اوسط تعداد ہے اور جو مختلف علاقوں میں تقسیم ہے۔

شاید ہم زیادہ مذہبی ہو گئے ہیں اور اس قسم کے مذہبی ہو گئے ہیں کہ اپنے مذہب کے احکام تو نہیں مان رہے لیکن اپنی رنجشیں، اپنی دشمنیاں نکالنے کے لیے مذہب کا غلط استعمال کر رہے ہیں۔ تو یہ ہم اپنے دین کی خدمت تو نہیں کرتے ہوئے نظر نہیں آ رہے بلکہ اپنے غلط کام دین کے کھاتے میں ڈالنے کی کوشش شروع کر رکھی ہے۔یہ طرزِ عمل غلط ہے اور ہم اس کی مذمت کرتے ہیں۔

قائد کی تقریر کے حوالے سے بات ہوئی تھی، یہ تقریر کسی خاص موقع پر کسی خاص تقریب کی تقریر نہیں ہے جیسے سیرت النبی کانفرنس میں قائد جاتے ہیں تو ظاہر ہے وہ اسلام کے تناظر میں ہی بات کر رہے ہوں گے لیکن اس تقریر کا حوالہ سیاسی حقوق کے حوالے سے اس لیے بڑا ضروری بنتا ہے کیونکہ یہ ایک سیاسی پلیٹ فارم سے پالیسی بیان ہے۔یہ پاکستان کا گورنر جنرل تقریر کر رہا ہے، پارلیمنٹ کو مخاطب ہو رہا ہے اور پہلی پارلیمنٹ سے مخاطب ہو رہا ہے۔تو میرے خیال میں اس تقریر کی نوعیت باقی تقاریر سے مختلف ہے۔اس لیے اس تقریر کو ایسے حقوق کی بات کرنے کے لیے

حوالے کے طور پر لیا جاتا ہے۔ میں تو آپ کو اور بھی بہت سی تقاریر بتا سکتی ہوں، میں نے خود اس پر ریسرچ کی کیونکہ مجھے بھی کسی نے ایسی تقریر پر چیلنج کیا تھا تو میں نے خوب تحقیق کے بعد 80 صفحات کا مقالہ اس پر لکھا۔ ہم خواہ مخواہ تو نہیں شور مچاتے۔ تحریک پاکستان کے دوران جو تقاریر ہیں، جہاں غیر مسلموں نے بلایا ہے اور جہاں اجلاس ہوئے ہیں اور جیسے ہوئے ہیں وہاں قائد کی باتیں بھی ہیں، اور بڑی زبردست باتیں ہیں۔ اس میں سے ایک حوالے کے طور پر میں آپ کو سنا دیتی ہوں کہ دھوبی گھاٹ فیصل آباد میں جلسہ تھا، وہاں قائد کو مسیحیوں نے بلایا ہوا تھا۔ تو انہوں نے مسیحیوں کو مخاطب کر کے کہا کہ ''آج جب ہمارے اپنوں نے ہمارا اعتبار نہیں کیا اور آپ نے اپنا مستقبل ہمارے ہاتھ میں دے دیا ہے ہم آپ کا احسان نسل در نسل یاد رکھیں گے''۔ یہ ریکارڈ پر ہے اور ایسے کئی اقتباس کیونکہ میں نے خود تحقیق کی ہے تو میں آپ کو سنا سکتی ہوں، تو یہ پالیسی بیان ہے اس لیے اس کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

تیسری نشست

پاکستان کا نظام تعلیم اور سماجی ہم آہنگی کی راہ میں حائل رکاوٹیں

ڈاکٹر خالدہ غوث

جب استاد کی اور سماجی ہم آہنگی کی بات ہوتی ہے تو ظاہر ہے اس معاشرے کو الگ کر کے تو بات نہیں کی جا سکتی۔ یہ معاشرہ وہ ہے جس کی ساخت میں بڑے تنازعات ہیں۔ فرقہ واریت کے مسائل بھی ہیں، سماجی طبقاتی تقسیم بھی ہے،، انتہا پسندی اور عدم برداشت پیدا ہو گئی ہے جس میں ہم سماجی مذہبی تنازعات کی بات بھی کر رہے ہیں۔ مزید یہ کہ مختلف سماجی طبقوں پر تشدد کی بات ہے جس میں سماجی اور ثقافتی نوع کے تنازعات بھی ہیں۔ تشدد کی ان نوعیّتوں میں ثقافتی، سیاسی اور مذہبی پہلو بھی شامل ہیں، نتیجہ اس کا یہ ہے کہ معاشرہ تقسیم در تقسیم کا شکار ہے، ٹکڑوں میں بٹا ہوا، ظالمانہ حد تک منقسم۔ اور یہ ساری چیزیں انفرادی طور پر کچھ طبقات کے اندر شناخت کے مسائل کو

ختم کر رہی ہے، کچھ کے اندر مختلف قسم کے تضاد ہیں۔

ان تمام تنازعات میں استاد کو طے کرنا ہے کہ وہ کس قسم کے ذہنوں کو پیدا کرے، وہ ذہنوں کو کھول سکتا ہے تا کہ وہ مختلف زاویوں سے سوچیں، کس طرح سے ذہنوں کو پختہ کرے، انھیں سوچنے کی طرف مائل کرے، جوابات ڈھونڈے، زاویے تلاش کرے۔ تعلیمی ادارے بہت سی وجوہات کی بنا پر جو بنیاد ڈال رہے ہیں، اس سے معاشرے میں ایک بے جا خود احتسابی پیدا ہو رہی ہے۔ معاشرے کے اندر یہ 'سیلف سینسر شپ' کیوں پیدا ہوتی ہے۔ ابھی یہاں بیٹھے بیٹھے میں نے کچھ الفاظ نہیں بولے جو میں بولنا چاہتی تھی۔ یہی چیز اداروں میں بھی ہے۔ جب ہم لیکچر دے رہے ہوتے ہیں تو بچے کو کچھ چیزوں کی طرف مائل کرتے ہیں کہ بیٹا اپنے ذہن کو کھولو، سیکھنے کا عمل پیدا کرو، سوچنے کے عمل کو تحریک دو، پھر ہم بچے کو کہہ دیتے ہیں بس ہمارا کام یہی ہے۔ اس کے بعد اگر وہ نہیں سیکھتا تو بعض سزا بھی دیتے ہیں۔ اس طرح آپ ذہن کو روک دیتے ہیں، اور پھر یہ مار بڑھوتری اور بہتری کے عمل کو روک دیتی ہے۔ بند ذہنوں کو کھولنے کی ضرورت ہوتی ہے اور جب آپ بند ذہنوں کو کھولتے ہیں، وہاں کہیں نہ کہیں اس عمل کا آغاز کرتے ہیں جہاں ہر شخص انفرادی طور پر اس معاشرے کا 'سٹیک ہولڈر' ہو جاتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں جب بچہ سکول سے کالج، کالج سے یونیورسٹی میں آتا ہے تو مراحل میں وہ اس معاشرے کا فرد بن رہا ہوتا ہے۔ اسے 'سٹیک ہولڈر' بنانا ہوتا ہے تا کہ اس میں اس معاشرہ سے وابستگی کا احساس پیدا ہو۔ جب ہم کہتے ہیں کہ 'ذمہ دار شہری'، تو ذمہ دار اور باشعور شہری استاد کیسے پیدا کرتا ہے؟ میں جب پچاس منٹ کا لیکچر دیتی تھی تو طریق کار بہت غیر رسمی ہوتا تھا۔ بچہ وہ لیکچر کاپی پر نہیں اتار سکتا تھا، اس میں نصف حصہ بحث مباحثے کا ہوتا تھا، اور باقی نصف رسمی لیکچر۔ بچے کو ذمہ دار شہری بنانے کا کوئی لکھا ہوا نسخہ تو نہیں ہے، یہ تو ذہن کو اعتماد دینے کا عمل ہے جو بچے کے ذہن کو نشو ونما دیتا ہے۔

میں تو یہ کہا کرتی تھی بیٹا اگر تمھیں درست طور پر بات کرنا نہیں آ رہا، انگریزی صحیح نہیں آتی، اردو صحیح نہیں آتی تو بھی بات کرو۔ زبان میرے لیے اہم نہیں ہے۔ آج اگر تم غلط نکتہ اٹھاؤ گے تو

کل ٹھیک اٹھاؤ گے۔ دوسری بات جو میرے خیال میں انتہائی اہم ہے، کہ ہمارے ہاں اتنے تعلیمی نظام ہیں اور میں بات مدرسے اور مغربی قسم کے نظام کی نہیں کر رہی تعلیم کے رسمی اور غیر رسمی ہونے کی بات کر رہی ہوں۔ آج جب میں خیابان کشمیر سے گزرتی ہوں تو الٹی طرف دیکھتی ہوں کہ ایک میدان میں کرسیاں پڑی ہوئی ہیں پھر کسی اور طرف سے نکلتی ہوں۔ تو وہاں پر کرسیاں پڑی ہوتی ہیں۔ جب ریاست نے تعلیمی عمل کی ذمہ داری لینے سے ہاتھ اٹھالیا ہے تو معاشرہ سمجھتا ہے یہ بوجھ میرے کندھوں پر آ گیا ہے۔ اور یہ کسی نے اپنے آپ کو دعوے دار سمجھ لیا ہے۔

تیسری بات کہ جو بہت اہم ہے کہ آپ کا استاد کا اتنا بااثر نہیں۔ معاشرے کی دوسری چیزیں اتنی بااثر ہیں کہ وہ جو اسکول کالج یونیورسٹی میں استاد نے پڑھایا ہوتا ہے، دوسری چیزیں اس پر ترجیح لے جاتی ہیں ۔ میں اگر ڈھائی تین سال کے بعد بچے سے پوچھوں، تھیوری نہ بھی پوچھیں، کتابوں کے نام ہی پوچھ لیں کہ بھئی کیا چیزیں پڑھیں تھیں وہ یاد نہیں کر پاتا۔ تو آج کے بچوں کا سیکھنے کا عمل بہت تیز ہے۔ دوسری چیزیں بہت جلدی اثر کر رہی ہیں جسے آپ روک نہیں سکتے۔ یہ ٹیکنالوجی کا دور ہے، یہ عالمگیریت کا دور ہے، اس میں چیزوں کی ترجیحات طے کرنا پڑتی ہیں۔ آپ اس اثر پذیری کو روک نہیں سکتے۔ لیکن طالب علموں میں ترجیحات کو پرکھنے کی صلاحیت پیدا کرنی چاہیے۔ ایسا طالب علم معاشرے کے شہری کے طور پر بہت مستحکم شخصیت رکھتا ہے۔

سوشل میڈیا اور سماجی ہم آہنگی

سبوخ سید

بہت سنجیدہ گفتگو ہو رہی تھی، عامر رانا صاحب نے بہت فکر انگیز گفتگو کی، انہوں نے جو نکتہ آٹھایا وہ انہیں کو آگے لے کے جانا چاہیے تھا۔ سوشل میڈیا کے حوالے بات ہو رہی تھی۔ میں تھوڑا سا آپ کو اعداد و شمار کے چکروں میں لے کے جانا چاہوں گا۔ اس دنیا میں تقریباً ساڑھے سات ارب آبادی ہے جس میں سے ساڑھے تین ارب آبادی انٹرنیٹ استعمال کرتی ہے۔ پاکستان کی

آبادی بیس کروڑ ہے جس میں سے چار کروڑ انٹرنیٹ استعمال کرتی ہے۔ 2016ء میں جو ہمارے پاس اعداد و شمار آئے، اس کے مطابق 25 ملین لوگ صرف فیس بک استعمال کر رہے تھے۔ جب 2017ء کی رپورٹ آئی تو صرف سات آٹھ ماہ میں تعداد پچیس ملین سے پینتالیس ملین تک پہنچ گئی۔ فیس بک کے استعمال میں یہ اضافہ بڑی تیزی سے ہو رہا ہے۔ جو لوگ استعمال کر رہے ہیں ان کی عمریں کتنی ہیں؟ یہ 30 سال کے نوجوان ہیں۔ یہ وہ طالب علم ہیں جو آپ کی کلاس میں آپ کے سامنے بیٹھے ہوں گے یا باہر کے ہوں گے۔ لیکن زیادہ وہی ہیں جو آپ کی کلاس میں بیٹھے ہوں گے۔

یوٹیوب کے صارفین پوری دنیا میں ڈیڑھ ارب ہیں۔ یہ بھی آپ کو معلوم ہوگا یوٹیوب پر ہر ایک منٹ میں چار سو ویڈیوز اپ لوڈ ہوتی ہیں۔ گوگل کے بعد یوٹیوب سب سے بڑا سرچ انجن ہے۔ تو بہت زیادہ فائدے بھی ہیں سوشل میڈیا کے اور بہت زیادہ منفی پہلو بھی ہیں۔ سوشل میڈیا پر موجود مواد کی تصدیق کا کوئی عمل نہیں ہے۔ اس کے بغیر چیزیں آ بھی رہی ہوتی ہیں اور جا بھی رہی ہوتی ہیں۔ غیر مصدقہ ہونے کے مسائل کو ایک طرف رکھ کر میں آپ کو بتاتا ہوں کہ اس کے فائدے کیا ہیں۔

ابھی تک جو معلومات ہمارے پاس آئی ہیں کہ ہمارے ہاں 90 فیصد لوگوں نے خبر نامے دیکھنا چھوڑ دیے ہیں، مین سٹریم میڈیا کو دیکھنا چھوڑ دیا ہے، بس سوشل میڈیا کی طرف رجحان بڑھ رہا ہے۔ اس میں یہ بھی ہے کہ ہمارے جتنے ٹی وی چینل ہیں انہوں نے بھی اپنے سوشل میڈیا کے پیجز بنائے ہیں اور وہ وہاں پہ براہِ راست چلتے ہیں۔ جیو کا ہر بلٹن ان کے سوشل میڈیا پیج پر براہِ راست آتا ہے۔ اسی طرح دوسرے ٹی وی چینلز نے بھی اپنے تمام بلٹن اور ٹاک شوز سوشل میڈیا پر براہِ راست پیش کر دیے ہیں۔

ہم لوگ مانیں یا نہ مانیں لیکن سوشل میڈیا ہماری زندگی میں بہت زیادہ سرایت کر چکا ہے۔ ہم اپنی گفتگو میں اس کا حوالہ دیتے ہیں کہ فلاں نے کیا کہا اور فلاں نے کیا کہا۔ کیا تم نے فلاں کی

ٹویٹ پڑھی؟ ٹویٹ! تو ماشااللہ بڑی سرگرم عمل چیز ہے۔صرف ایک ٹویٹ نے ہمارے ملک کے میں دو تین ماہ کے لیے ہلچل پیدا کر دی تھی۔

واٹس ایپ کا استعمال اور اہمیت بھی بہت بڑھ گئی ہے۔اب تو تقریاں بھی اسی پر ہونے لگی ہیں۔اس میں فائدہ بھی ہے کہ جب آپ چاہتے ہیں اپنی کلاس کے بچوں سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ جب کوئی اخبار چھپتا ہے تو وقت لگتا ہے، ایک دن، ایک ہفتہ بعد چھپے گا جبکہ سوشل میڈیا پر کچھ لمحوں میں آپ ردِعمل دے سکتے ہیں تو اس کی مقبولیت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کا استعمال بہت زیادہ آسان ہے۔لوگ بہت بڑی تعداد میں اس کو دیکھتے اور پسند کرتے ہیں اور اس کے ذریعے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔سب سی بڑی بات کہ بااثر حلقے مین سٹریم میڈیا پر چھپی خبروں پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔سوشل میڈیا پر یہ معاملہ نہیں ہے، اس پر کہیں نہ کہیں سے خبر نکل آتی ہے۔ایک اور اچھی بات ہمارے جو دوست جن کے مضامین اخباروں میں نہیں چھپتے، چینلز پر خبر نہیں آتی، وہ ہمارے پاس آجاتے ہیں۔یا کوئی دوسرے لوگوں کے پاس ویب سائٹس ہیں وہاں پر چھپ جاتی ہیں، اس کا مطلب یہ کہ آپ کچھ چھپا نہیں سکتے۔تاہم تکلیف دہ بات یہ ہے کہ لوگوں نے خود کو یہاں تک محدود نہیں رکھا بلکہ جب بھی ان کو لگتا تھا کہ ان کے خلاف کوئی پالیسی بننے جا رہی ہے، یا ان کے انتخاب کے خلاف کوئی بات کر رہا ہے تو انہوں نے اپنے بلاگ بنا لیے اور لکھنا شروع کر دیا۔آپ کو پتا ہے کہ پانچ بلاگرز کو اٹھا لیا گیا تھا تو وجہ یہ سامنے آئی تھی کہ توہین رسالت والا ایشو ہے۔لیکن ثابت نہیں ہو سکا تو انہیں چھوڑ دیا گیا کیونکہ اگر ثابت ہوتا تو سزا دی جاتی۔

آپ دیکھیں کہ سوشل میڈیا کے پانچ پیجز نے آپ کی پوری مشینری کو ایک طرح سے ڈسٹرب کر دیا۔اور آپ کو معلوم ہے کہ ان دو تین ماہ میں تقریباً ہر روز سب لوگ ایک آدھ ہیڈ لائن لازمی پڑھتے تھے۔میں نے 2016ء کی ایک رپورٹ نکالی جس کے مطابق بیس ایسی بڑی خبریں

تھیں جس کو ہماری مین سٹریم میڈیا نے سوشل میڈیا سے اٹھایا تھا۔یعنی مین سٹریم میڈیا لیڈ نہیں کر رہا تھا بلکہ سوشل میڈیا لیڈ کر رہا تھا۔اب عمران خان صاحب کے پیج پر پینسٹھ لاکھ لوگ ہیں، جیسے ہی پوسٹ ہوتی ہے تو لاتعداد کارکن آجاتے ہیں اور کئی پیجوں پر کروڑوں کی تعداد تک پہنچا دیتے ہیں۔ انڈیا کے حوالے سے بات ہوئی کہ سوشل میڈیا لوک سبھا کی 120 نشستوں پر اثر انداز ہو سکتا ہے یعنی انتخابات پر بھی فیس بک اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔جب کشمیر پر ظلم ہوا تو سوشل میڈیا نے ہی اس ظلم و بربریت پر آواز اٹھائی۔

تمام سیاسی جماعتوں اور مذہبی جماعتوں یہاں تک کہ مدارس نے بھی اپنے پیجز بنائے ہیں کیونکہ رسالہ چھاپنا بہت مشکل کام ہے جبکہ پیج بنانا بہت آسان۔شاہ زیب اور سکندر جتوئی کا معاملہ سوشل میڈیا ہی کی وجہ سے تھا۔آپ کو یاد ہے اس شامی بچے کی تصویر جس نے پوری دنیا کو ہلا کر رکھا دیا۔یعنی آپ کسی قسم کا بھی پروپیگنڈا پھیلا سکتے ہیں۔

اب تو سیاسی جماعتوں نے باقاعدہ سوشل میڈیا سیکرٹری رکھ لیے ہیں۔دو ہفتے پہلے پیپلز پارٹی نے اپنے سوشل میڈیا سیکرٹری کا اعلان کیا کہ ان کے سوشل میڈیا کا ونگ بنا دیا جائے گا۔پی ٹی آئی نے تو بہت پہلے یہ کام شروع کر دیا۔ایک دلچسپ بات یہ کہ ہر پانچ میں سے ایک جوڑا سوشل میڈیا پہ بنتا ہے۔اس طرح کثرت سے طلاق بھی ہوتی ہے۔بہت سے جعلی فتوے اور تحریریں بھی سوشل میڈیا پر گردش کرتی رہتی ہیں، جیسا کہ عرفان صدیقی کے سٹائل کا کالم، جس کا موضوع تھا۔''ملا فضل اللہ کی زندگی کے روشن پہلو'' اور یہ کالم جنگ میں کہیں نہ چھپا اور نہ عرفان صدیقی صاحب نے لکھا نہ کبھی دیکھا لیکن خود سے یہ کالم لکھ کر اسی اسٹائل میں چھاپ کہ سوشل میڈیا پر پوسٹ کر دیا۔ اور کراچی کہ ایک سینئر صاحب تھے جنہوں نے یہ ڈالا تھا تو ان کی بات سے وہ زیادہ شیئر ہو چکا تھا۔ اسی طرح جامعہ بنوریہ عالمیہ سائیٹ کراچی کے قریب بیس فتوے تھے۔وہ فتوے بڑے مزے کے اور بڑے لاجیکل تھے۔یعنی مثال کے طور پر ایک فتویٰ تھا

لاتلقوا بایدیکم الی التھلکة (آیت قرآنی)

''اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو'' اس میں یہ لکھا ہوا تھا کہ رمضان کا مہینہ تھا اور بڑی سخت گرمی تھی تو تمام لوگ بڑے پریشان ہوئے کہ اوپر اتنے بڑے ادارے کا نام ہے۔ ہم لوگ ایسی باتوں کو بہت زیادہ پھیلاتے بھی ہیں۔ 2 سال پہلے گرمی کی شدید لہر کی وجہ سے انڈیا اور کراچی میں بہت ہلاکتیں ہوئیں اور کراچی میں تو ایک دن میں دو سو سے زیادہ ہلاکتیں ہوئیں۔

اس طرح کے جو فراڈ تھے اس کی وجہ سے حکومت نے فیصلہ کیا کہ اگر آپ کو کوئی تنگ کرتا ہے، کوئی آپ کے نام پر سٹیٹس اپ لوڈ کرتا ہے اس کے لیے سائبر کرائم بل بنایا گیا۔ مثال کا جو کیس تھا اس نے خود لکھا تھا کہ کوئی میرے نام سے فیس بک پیج چلا رہا ہے۔ ایسے ہی حکومت نے خواتین کو تنگ کرنے والوں کے لئے بھی قانون بنایا، صرف چھ ماہ میں سات سو تریسٹھ شکایات موصول ہوئیں۔ مطلب یہ دیکھیں کہ لوگ کتنا تنگ آ چکے ہوں گے کیونکہ ہمارے ہاں تو لوگ تھانے میں جانے سے ڈرتے ہیں، کہ تھانے جا کر مزید وقت ضائع ہوگا، سننا کسی نے ہے نہیں۔ یہاں تک کہ اگر کسی کے ساتھ ظلم ہو رہا ہے تو وہ بھی کہتے ہیں کہ تھانے کو چھوڑو یہیں بیٹھ کر ڈیل کر لیتے ہیں، تو سات سو تریسٹھ لوگوں نے شکایات جمع کرائی ہے کہ سوشل میڈیا میں ہمارے ساتھ ایسا ہو رہا ہے اور بڑی آسانی سے کسی کی تصویر بنا کر سوشل میڈیا پر ڈال دیتے ہیں بلکہ سر کاٹ کر نیچے دھڑ کسی اور کا لگا دیتے ہیں جسے فوٹو شاپ کہتے ہیں لیکن لوگ فوری طور پر آ کر لائک کرتے ہیں اور قبول کر لیتے ہیں۔ لوگوں میں یہ احساس پیدا کرنے کی ضرورت ہے کہ سوشل میڈیا پر جو باتیں آ رہی ہیں وہ مصدقہ نہیں اور اس سے ہماری سوسائٹی میں مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔

یوٹیوب پر جائیں تو صرف شیعہ سنی موضوع پر پانچ سال کا مواد پڑا ہوگا، اسے سنیے۔ فیس بک پر بھی ایسے ہی معاملات ہیں، کتابوں کی تصویریں لگی ہیں۔ شیعہ، بریلوی، اہل حدیث، دیوبندی لوگوں نے یوٹیوب چینل بنائے ہوئے ہیں۔ لاہور سے تعلق رکھنے والے ایک معروف عالم ہیں، وہ ہر روز حکومت کو گالیاں دیتے ہیں، فوج کو گالیاں دیتے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں لوگوں نے اس چینل کو سبسکرائب کیا ہوا ہے۔ جونہی کوئی ویڈیو آتی ہے تو وہ ہزاروں، لاکھوں کی

تعداد میں دیکھی جاتی ہے۔ ملا فضل اللہ سے متعلق خبر کی تلاش میں جب سوات جاتے تھے تو تقریباً ہر روز اس کا خطبہ سنتے، دلچسپ بات یہ ہے کہ اتنی خوبصورت گفتگو کرتا تھا دل کہتا رکو تھوڑی دیر اور ان کو سنتے ہیں۔ اسی طرح یہ لاہور کے عالم صاحب ہیں جو بہت عمدہ گفتگو کرتے ہیں، لوگوں کا جی چاہتا ہے کہ اس کو سنیں اور سنتے سنتے کئی ہمارے لوگ ان سے متاثر ہونے لگ گئے۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ حکومت نے ابھی تک اس کو بند نہیں کیا۔ اور کچھ دوستوں نے بتایا کہ ہم نے پی ٹی اے کو شکایات بھی لکھی ہیں۔ کیسی بات ہے کہ یوٹیوب پر گستاخانہ مواد پر تو احتجاج کریں لیکن اپنے ہی ملک کے شہریوں کو لڑانے والے کے خلاف کوئی اقدام نہ کریں۔

ایسے ہی ایک شخص کو یوٹیوب پر گستاخانہ مواد شائع کرنے کی وجہ سے باقاعدہ تیرہ سال کی سزا ہوئی۔ حکومت نے باقاعدہ مقدمہ چلایا۔ اسی لیے جب ہم کہتے ہیں گلوبل ولیج تو حقیقتاً سوشل میڈیا نے اس دنیا کو گلوبل ولیج بنا دیا ہے۔ پہلے جو کالیں ہزاروں میں کیا کرتے تھے اب واٹس ایپ پر فری کرتے ہیں۔ جہاں بہت زیادہ سہولتیں ہیں وہیں بہت زیادہ خرابیاں بھی ہیں، ان کو کیسے روکا جائے۔ کچھ باتوں پر میں نے گفتگو کی، کچھ قانون سازی کے متعلق ہیں۔ کچھ لوگوں کو اور کچھ معاشرے کو حساس کرنے کی ضرورت ہے۔

رویہ سازی میں میڈیا کا کردار

مبشر زیدی

رہنمائی بنیادی چیز ہے، چاہے وہ استاد شاگرد کو دے، میڈیا عوام کو دے یا والدین بچوں کو دیں۔ بہت بنیادی مسئلہ یہ ہے جب رہنمائی نہیں ہوتی تو ظاہر ہے کہ ہم اپنے طور پر چیزوں کی تلاش و جستجو کرنا شروع کرتے ہیں۔ اس میں کچھ ایک طرف چلے جاتے اور کچھ بالکل دوسری طرف۔ بحیثیت صحافی میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ ہم انتہاؤں پر رہتے ہیں، بالکل مذہبی یا بالکل لبرل، حالانکہ ہمارا دین ہمیں میانہ روی کا درس دیتا ہے۔ آپ دوسرے کا نقطہ نظر بھی سنیں اور اپنا

بھی بیان کریں۔

جہاں تک میڈیا کی بات ہے تو رہنمائی میں میڈیا کا بھی کوئی خاص کردار نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ ریاست نے میڈیا کو بھی بطور وسیلے کے استعمال کیا چاہے وہ کسی کا بھی نقطہ نظر آگے بڑھانے کے لیے کیا ہو۔ مختلف مواقع پر ریاست مختلف بیانیے اختیار کرتی ہے۔ چین کے ساتھ تعلقات کا معاملہ ہو، امریکہ کے ساتھ ہو یا ایران کے ساتھ، ہر موقع پر مختلف بیانیہ ہوتا ہے۔ یہ مثالیں تھیں یعنی کہ ہمیں پاکستانی بن کر سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔ ہم لوگ ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ کر صرف پاکستان کے متعلق سوچیں۔ آج بھی اگر آپ کسی سے بلوچستان کی بات کریں تو وہ کہے گا چپ کر جاؤ، سی پیک گیم چینجر ہے۔ جو بھی سوال پوچھتا ہے، معاشرے میں اس کو یہ کہہ کر چپ کروادیا جاتا ہے کہ اس سے کوئی بڑا نقصان ہو جائے گا، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ عامر رانا صاحب نے جو پورا انڈیکس دکھایا ہے۔ میڈیا، یونیورسٹیاں، پالیسی ساز ادارے، حکومت یہ سب ایک دائرے میں آتے ہیں۔ ان سب سے ایک ملک کی پالیسی تیار ہوتی ہے۔ لیکن ہمارے ملک میں فرد واحد کی پالیسی ہوتی ہے، اس کے ذہن میں جو آتا ہے وہی پالیسی ہے، چاہے وہ فوجی آمر ہو چاہے وہ ہمارے جمہوری لیڈر ہوں۔ وہ اپنے آپ کو جمہوریت پسند کہتے ہیں لیکن ہوتے وہ بھی فوجی آمر کی طرح ہیں کیونکہ وہ بھی اکیلے ذہن سے سوچتے ہیں تو یہ چیزیں ختم کرنے کے لیے میڈیا کیا کردار ادا کر سکتا ہے۔

میڈیا کی سب سے بڑی اہمیت کا نکتہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں بہت کم ایسی جگہیں رہ گئی ہیں جہاں ہم بول سکیں، اپنی بات کر سکیں۔ میڈیا بدقسمتی سے یا خوش قسمتی سے ابھی وہ فورم ہے جہاں مختلف آراء پیش کی جاتی ہیں۔ لوگ اس سے اچھی بات بھی لیتے ہیں اور اس میں میڈیا کچھ غلط بھی کرتا ہے۔ بہت سی چیزیں میڈیا کی وجہ سے غلط بھی ہوئیں۔ لوگوں کی جانیں گئیں۔ اس میں اصل ذمہ داری ریاست کی ہے۔ ریاست نے اپنی ذمہ داری چھوڑی اور معاشرے میں یہ انتشار پھیلا جس کو ہم آج بھگت بھی کر رہے ہیں۔ یہی باتیں جو ہم کر رہے ہیں آج سے بیس سال قبل

لوگ ہم سے کر رہے ہوتے تھے کہیں خدانہ کرے کہ آج سے بیس سال بعد ہمارے بعد کی نسل کے سامنے بھی یہی مسائل ہوں، یا ہو سکتا ہے اس سے بھی زیادہ ہو جائیں۔ الیکٹرانک میڈیا جب آیا پندرہ سال ہو گئے تو اس کے بعد اسی وقت ریاست نے دیکھا کہ چونکہ ہمارے ہاں خواندگی کم ہے تو انہوں نے سوچا کہ پرنٹ میڈیا اتنا زیادہ ذہن سازی کے لیے کردار ادا نہیں کر سکے گا۔ لہٰذا ایک نیا وسیلہ لے آتے ہیں۔ چالیس پچاس چینلز کو لائسنس دے دیے گئے، صحافی اتنے تھے نہیں، ہزار پندرہ سو صحافی ہوں گے۔ باقی پھر کسی کا بھتیجا کسی کا بھانجا بغیر کسی استناد کے، بغیر کسی مہارت کے لوگوں کو بھرتی کیا گیا۔ اس میں ذاتی پسند ناپسند کے آدمی تھے۔ پھر ریاست نے میڈیا کو اشتہار بازی کے ذریعے قابو کیا، جو ذرا ہلتا تھا اس کے اشتہار بند کر دیں گے وغیرہ۔ اس کی وجہ سے ریاست کا بیانیہ پوری طرح سے آیا۔

پھر آپ نے دیکھا کہ اور ابھی بہت سی چیزیں ہوئی ہیں۔ مجھے نہیں پتا کہ اور کسی ملک میں رمضان ٹرانسمیشن ہوتی ہے۔ کوئی بھی شخص اپنے آپ کو ایک اسلامی اسکالر کے طور پر پیش کرتا ہے۔ جو ماہر نہیں ہوتے وہ آ کر بولتے ہیں تو میڈیا کے اندر خاصے مسائل اسی لیے ہیں کہ معاشرے ہی کا وہ عکس ہے۔ جو کچھ معاشرے میں ہے وہی کچھ میڈیا ہے لیکن میڈیا سے یہ ضرور توقع رکھی جاتی ہے کہ یہ نسبتاً کچھ پڑھا لکھا ہے۔ میڈیا میں آتے ہی شاید کچھ شعور دیں لوگوں کو لیکن جس حد تک میں اپنی سمجھ میں دیکھتا ہوں اس میں بجائے ملاوٹ کرنے کے آگے اسی طرح پہنچاتا ہوں چاہے وہ میری اپنی ذاتی پسند ناپسند کے لیے ناظرین کے لئے ہو یا کسی اور کیے لئے۔ تو یہ ساری چیزیں ہم نے دیکھی ہیں۔

ریاست کا بیانیہ پہلے یہ ہوتا تھا کہ جو خلاف بات کرے وہ غدار ہے۔ کسی پر غدار کا الزام لگا دیا کسی پر باہر سے پیسے لینے کا الزام لگا دیا۔ بہت سے اینکرز کو اسی وجہ سے بالکل پست کر دیا گیا کچھ کو مار بھی دیا گیا تاکہ وہ بول نہ پائے۔ ہمیں ایک دوسرے کی بات سننے کی، کہنے کی ہمت ہونی چاہیے۔ آج بھی ہمارے درمیان جو مکالمہ ہے اچھی بات ہے۔ کوئی بھی نظریہ ہر انسان کا اپنا نظریہ

ہوتا ہے چاہے وہ دینی ہو چاہے وہ معاشرتی ہو۔ ایک دوسرے سے ہم سنیں گے تو ایک سمت متعین ہوگی۔ میں بھی سوشل میڈیا پر خاصا ایکٹو ہوں۔ میں دیکھتا رہتا ہوں اور مجھے اکثر اپنے گھر میں یہ بات بتانی پڑتی ہے کہ یہ چیز غلط ہے اس میں ایسا نہ کریں۔ مثلاً روہنگیا مسلم کے ساتھ جو ہو رہا ہے لوگوں نے کیا کیا کہ نائجیریا کے جلے ہوئے گھروں اور لوگوں کی تصاویر لگائی اور کہا کہ یہ روہنگیا مسلمان ہیں۔ وہاں مسلمانوں کے ساتھ کیا ہو رہا ہے، آپ وہاں کیوں جہاد کے لیے نہیں جا رہے۔ پھر آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک تصویر بڑی چلتی رہی ہے کہ ایک بچے کا جوتا ہے جو آگ میں ہے وہ آج کا نہیں۔ رملہ میں ایک فلسطینی بچے کو مارا تھا ایک اسرائیلی فوجی نے لیکن وہ جوتا اے پی ایس کے واقعے کے بعد بھی تصویروں میں آتا رہا۔

ہمارے اندر سے تحقیق کا عمل بالکل ختم کر دیا گیا ہے۔ کچھ ایسی چیزیں ہوگئیں جس پر ہم بالکل سوال ہی نہیں کر سکتے مثلاً ہمارے اندر اب کچھ دوست پی ایچ ڈی کر رہے ہوں گے کچھ یونیورسٹیوں کے ہوں گے، کیا ہم میں سے کوئی ایبٹ آباد جا کر یہ تحقیق کر سکتا ہے کہ اسامہ بن لادن کو کیسے مارا گیا؟ کن حالات میں مارا گیا؟ کیا کوئی طالب علم یہ سوچ سکتا ہے؟ لیکن اس لیے چونکہ یہ ہمارے ملک میں ہوا۔ اسی اسامہ بن لادن پر امریکہ میں دس صحافیوں نے کتاب لکھی ہے۔ ہمارے کس صحافی نے کتاب لکھی؟ ریمنڈ ڈیوس کا واقعہ لاہور میں ہوا۔ آج اس کے دس سال بعد پانچ سال بعد ہمیں وہاں سے پتہ لگ رہا ہے کہ کون کون ملوث تھا۔ پوری ریاست نے عوام کو دھوکے میں رکھا کہ جناب قومی غیرت کا مسئلہ ہے اور اس میں سب ملوث تھے۔ میری اس کے بعد لوگوں سے بات ہوئی تو کوئی کہہ رہا تھا فوج ملوث ہے کوئی کہہ رہا تھا نہیں سویلین ملوث تھے حالانکہ سب شریک تھے۔ اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ عوام کو آپ کسی نئے ٹرک کی بتی کے پیچھے لگا دیں چاہے وہ کچھ بھی ہو اور ان کے اندر سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو جائیں۔ الیکٹرانک میڈیا وہی کر رہا ہے۔ ٹاک شوز ہیں جو ہمارے حقیقی مسائل پر بات کرتے ہیں، تعلیم پر بات کرتے ہیں۔ کسی بھی معزز معاشرے میں استاد سے بڑی حیثیت کسی کی بھی نہیں ہوگی۔ کسی بھی ترقی یافتہ ملک میں آپ چلیں جائیں۔ امریکا، یورپ میں استاد سے بڑھ کر کسی دوسرے فرد کی عزت نہیں ہوگی۔ ہمارے ہاں استاد کو کیسے کیسے دکھایا جاتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ تشدد کر دیا بچے پر۔ تشدد کرنا بھی غلط ہے لیکن باقی تعلیم کے لئے کیا ہوا ہے وہ تو میڈیا نہیں دکھاتا۔ باقی اساتذہ جو اچھے ہیں ان کو بھی دکھانا چاہیے لیکن اس کے ساتھ ساتھ کیا وہی اساتذہ اپنے شاگردوں سے وہی باتیں کر رہے ہیں کیونکہ آج کے دور میں اپنے بچوں سے یہ ضرور کہنا پڑتا ہے کہ جہاں بھی پڑھنے جاؤ کوئی تمہیں ہاتھ نہ لگائے تمہاری مرضی کے بغیر چھوئے نہ۔ کیونکہ ایسے واقعات آتے رہتے ہیں۔ یہی چیز یعنی تھوڑا سا شعور آپ نے نئی نسل کو دینا ہے۔

سماجی ہم آہنگی اور مذہبی رواداری میں اساتذہ کا کردار

ساتویں ایک روزہ تربیتی ورکشاپ

24 جولائی 2017ء، مری

پہلی نشست

صدارت: ڈاکٹر قبلہ ایاز

سابق وائس چانسلر، پشاور یونیورسٹی

مقررین: ○ پاکستان کا فکری چیلنج

ڈاکٹر خالد مسعود

سابق چیئرمین، اسلامی نظریاتی کونسل

○ عمومی رویّوں میں عدم برداشت

خورشید ندیم

کالم نگار، اینکر پرسن

دوسری نشست

صدارت: ڈاکٹر قبلہ ایاز

سابق وائس چانسلر، پشاور یونیورسٹی

مقررین: ○ ہماری وسعت نظری

محمد عامر رانا

ڈائریکٹر، پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز

○ معاشرے میں عدم برداشت اور میڈیا کا کردار

مبشر زیدی

سینئر صحافی، تجزیہ نگار و اینکر پرسن

○ سوشل میڈیا اور سماجی ہم آہنگی

سبوخ سید

صحافی و اینکر پرسن

پہلی نشست

پاکستان کا فکری چیلنج

ڈاکٹر خالد مسعود

سب سے پہلے تو میری یہ خوش قسمتی ہے کہ یہ مکالمہ، یہ مجلس اہلِ علم کے ساتھ ہے اور ان اہلِ علم کے ساتھ ہے جن کو ان مسائل کا پہلے سے احساس بھی تھا لیکن ان کی طرف توجہ نہیں دی گئی اور اب ہر طرف سے یہی کہا جا رہا ہے کہ یونیورسٹیوں کو کچھ کرنا چاہیے۔ میں بات اس سے شروع کروں گا تاکہ آپ کو چیلنج کا، یا کم از کم میرے احساس کا، اندازہ ہو کہ ہم حالتِ جنگ میں ہیں لیکن کوئی بھی یہ نہیں سوچ رہا کہ ہم حالتِ جنگ میں ہیں۔ ہم یہی سمجھ رہے ہیں کہ یا تو وہ دور ختم ہو چکا اور یا یہ سمجھ رہے کہ یہ ایک طبقہ ہے جو ایسی باتیں کر کے ہمیں پریشان کر رہا ہے ورنہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے۔

یہ رویے پاکستان کے شروع سے ہی ہیں۔ ہم بات کر رہے ہیں فکری چیلنج کی لیکن میرا خیال ہے کہ جتنی بے فکری ہمیں ہے ہر چیز سے اس میں فکری کے معنی بھی شاید بے فکری کے ہو گئے ہیں۔ فکری چیلنج کے لیے سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ''چیلنج'' کا میرے خیال میں ابھی تک اردو میں ترجمہ نہیں ہوا ہے۔ گویا یہ چیز ہمارے ذخیرۂ الفاظ ہی میں نہیں ہے۔ اس کے لیے ہم جتنے بھی الفاظ استعمال کرتے ہیں یا تو عربی سے یا دوسری زبانوں سے، بہتر یہی ہے اس کو انگریزی لفظ رکھا جائے لیکن اردو میں اس کا متبادل لفظ نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی نہ کسی حد تک ہمارے ذہنوں میں چیلنج کا وجود نہیں ہے۔ آپ غور کریں جس وقت کوئی سوال اٹھاتے

ہیں تو ہمارے ہاں جو روایتی انداز ہے تو یہ کہتے ہیں کہ یہ شبہات ہیں۔ یعنی ہماری جو روایت ہے ہماری جو فکر ہے اس میں کوئی جھول نہیں ہے، یہ صرف شبہات پیدا ہوئے ہیں، ان سے بات کریں گے تو یہ شبہات دور کر دیے جائیں گے۔ دوسری طرف چیلنج کے جو معنی ہیں وہ ہیں للکار کے، یعنی آپ لڑائی شروع کرنے سے پہلے، جنگ میں آنے سے پہلے ایک للکار دیتے ہیں۔ اسی طرح ایک دشمنوں نے حملہ کر دیا ہے یا چوروں نے حملہ کر دیا ہے تو للکارا دیتے ہیں۔ للکار کے بعد آپ کو حق ہوتا ہے کہ آپ گولی مار دیں۔ دوسرا پہلو چیلنج کا یہ ہے کہ لڑائی ہے اور لڑائی میں آپ کو کسی طرح کی نرمی نہیں دکھانی۔ یہ دونوں رویے خطرناک ہیں پہلے میں ہم یہ سمجھ رہے ہیں کہ یہ شبہ ہے، ہم بالکل صحیح ہیں، صحیح راستے پہ ہیں۔ ہم میں کوئی کمزوری نہیں ہے اور دوسرے میں یہ ہے کہ یہ جنگ ہے تو اس میں اب اخلاقیات اور جھوٹ سچ کا کوئی دخل نہیں ہے۔ ہمیں ان سب چیزوں کو دیکھنا ہے کیونکہ اب ہم بہت جانیں ضائع کر چکے ہیں۔ اپنی شناخت میں بھی بہت سے مسائل پیدا کر چکے ہیں اور ساری دنیا اب ہم پہ تنقید کر رہی ہے۔ یہ ساری چیزیں ہمیں سامنے رکھنی ہیں۔

پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز نے اس مسئلے کو سنجیدگی سے لیا اور اس پر تسلسل اور تواتر کے ساتھ بحثیں ہوئیں اور اس میں ان لوگوں سے بھی بحثیں ہوئیں جو ان مسائل کو سمجھتے تھے اور ان لوگوں سے بھی جو پالیسی سازی کے ذمہ دار ہیں۔ اس پر ایک رپورٹ بھی بن کر شائع ہو چکی ہے جس میں ہمارے آج کے موضوع پر بھی بات ہوئی ہے۔ تعلیمی پہلو کے حوالے سے اس میں بحث ہوئی ہے، اس میں صفحہ 20 سے صفحہ 21 تک تعلیمی اصلاحات اور اس میں کیا سفارشات سامنے آئی ہیں، مختلف بحثوں میں اس کا خلاصہ ہے۔ پھر یہ کہ تعلیمی ادارے کیا کر رہے ہیں؟ ان کی ذمہ داری کیا ہے؟ اور تعلیم کے مسائل میں ہماری مذہبی فکر کا بڑا دخل ہے اس کے بارے میں کیا جھگڑے ہیں؟ کیا تنازعات ہیں؟ مسائل میں ہماری مذہبی فکر کا بڑا دخل ہے اس کے بارے میں بھی تجاویز ہیں۔ آپ ان کو دیکھ لیجیے گا۔ آپ کو اندازہ ہوگا کہ اس کے بارے میں دوسرے لوگ کیا سوچ رہے

ہیں اور اس کے بارے میں کیا سفارشات آئی ہیں۔

پاکستان کے فکری چیلنج کے متعدد پہلو ہیں، اس لیے بات بہت پیچیدہ ہو جاتی ہے۔ اس کے سماجی پہلو بھی ہیں، سیاسی پہلو بھی اور تہذیبی پہلو بھی۔ اور اس میں جوں جوں آپ بات کرتے چلے جاتے ہیں تو آپ کو پتہ چلتا ہے کہ اس کی کتنی وسعت ہے، کتنی گہرائی ہے اور اس کی وجہ سے یا تو آپ حوصلہ ہار کے بیٹھ جاتے ہیں کہ اس کو کہاں سے شروع کریں، اور کریں بھی یا نہ کریں؟ دوسرا یہ اتنا لمبا چوڑا موضوع ہے جو ایسی مختصر مجلس یا ورکشاپ میں نمٹ نہیں سکتا۔

میں سماجی، سیاسی اور تہذیبی پہلوؤں کا ذکر نہیں کروں گا صرف فکری پہلو کا ذکر کروں گا۔ فکری میں سب سے پہلی وجہ تو جیسے میں عرض کیا کہ ہماری بے فکری ہے لیکن فکری کی اہمیت اس لیے ہے کہ ایک چیز ہماری اپنی فکر میں ہماری مذہبی فکر میں ہماری سیاسی فکر میں بھی اور ہماری عقلیاتی یا تعلیمی فکر میں بھی ہے، یہ ہے کہ فکر کی اہمیت میں ہم فرد کو اہم نہیں سمجھتے، اجتماع کو اہم سمجھتے ہیں۔ معاشرہ کیسے سوچ رہا ہے؟ مقتدر طبقہ کیا سوچ رہے ہیں؟ فرد کو بھی ہمیں اسی طرح کی تربیت دینی ہے۔ نصاب سازی میں بھی جس وقت ہم بات کرتے ہیں تو اسی پہلو سے بات کرتے ہیں کہ فرد کی آزادی پیشِ نظر ہو کہ فرد کیا سوچ رہا ہے۔ دوسری چیز یہ کہ اس میں اپنائیت اور ملکیت کا احساس نہیں ہوتا، اگر وہ فرد کی اپنی سوچ نہیں ہے۔ آپ اس پر تھوپ رہے ہیں اور یہ کہہ کے کہ ہمارے بزرگوں نے یہ بتایا ہے، ہمارا اجماع اس پر ہے یا ہماری پارلیمنٹ یہ کہہ رہی ہے یا یہ رائے فلاں طبقہ کی ہے، تو فرد اسے اپنی سوچ اور رائے نہیں سمجھے گا۔ اس وقت تک کا جو یہ بحران ہے وہ اسی احساسِ ملکیت و اپنائیت کا مسئلہ ہے۔

نوجوان نسل کو آپ نے کشادہ دنیا میں چھوڑ دیا ہے، جس میں سوشل میڈیا بھی موجود ہے، انٹرنیٹ بھی موجود ہے۔ اس کو ساری معلومات مل رہی ہیں اور اس میں اس کو اجازت نہیں ہے کہ وہ اپنی رائے بنائے۔ آپ اس کو مجبور کر رہے ہیں کہ وہ کسی نہ کسی گروپ سے کسی نہ کسی آئیڈیالوجی سے کسی نہ کسی فلسفے سے منسلک کرے۔ اگر وہ خود اپنے اوپر کوئی لیبل نہیں لگاتا تو آپ اپنی طرف

سے اس پر ایک لیبل لگا کر اس سے بات کرتے ہیں۔

فرد کی اہمیت جب ختم ہوئی تو اس کی وجہ سے ہم نے یہ سمجھا کہ اصل میں اہم شے معاشرہ ہے، یا اجتماع ہے، یا قومیت ہے، یا مذہب ہے۔ یہ سب چیزیں فرد کی نہیں ہیں۔ اس کا دوسرا پہلو جو اہم ہے، ہماری جو نسل ستر ہویں صدی یا اٹھارہویں صدی سے انیسویں صدی سے مختلف معاشروں میں اور مختلف وقتوں میں آ رہی ہے وہ اپنے آپ کو مسلسل گھرا ہوا محسوس کر رہی ہے اور اس کے نئے پہلو سامنے آ رہے ہیں۔ مثلاً سب سے پہلے تھا کہ سائنسی اکتشافات آئے، اس کے بہت سے ٹکراؤ ہوئے، ہم سمجھتے تھے کہ یہ ہمارے عقائد کے خلاف ہے۔ پھر قومیت کا ٹکراؤ ہوا، ہم نے کہا نہیں جی ہم تو امت ہیں قوم نہیں ہیں۔ قوم پر آئے ہیں تو اب گلوبلائزیشن آ گئی ہے، ہمارے چیلنجز مسلسل آگے چلتے جا رہے ہیں۔ اسی طرح جب ہم کہتے ہیں کہ اعتدال پسندی کی روایت جامد ہے، وہ روایت بھی کبھی جامد نہیں رہی۔

روایت بھی بدلتی رہتی ہے لیکن ہم اس کے بدلنے سے انکار کرتے ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ہمارا فلسفہ اور مذہبی فلسفہ بھی جو ہم نے یونانی فلسفہ سے لیا ہوا ہے، اس میں تبدیلی نہیں آتی۔ تو تکمیلیت اچھی ہے تبدیلی سے۔ مثلاً ابنِ خلدون جیسا آدمی بھی کہتا ہے کہ طبیعیات (فزکس) کا مضمون بیکار ہے، اس کی بجائے مابعد الطبیعیات تکمیلیت کا حامل ہے کیونکہ طبیعیات تو ان چیزوں کا نام ہے جو ختم ہو جاتی ہیں، گل سڑ جاتی ہیں، مابعد الطبیعیاتی مظاہر ہمیشہ رہتے ہیں۔ ان تصورات میں ہمارے علم کے تصور نے بھی اثر کیا۔ وہ اب آ کر ہمیں سمجھ آ رہی ہے کہ ہم دوسروں کی ٹیکنالوجی تو لے رہے ہیں لیکن ٹیکنالوجی کے فلسفے سے بھاگ رہے ہیں۔ فلسفیانہ سائنس بہت کم پڑھائی جا رہی ہے ہمارے ہاں، بلکہ اب تو فلسفے کا مضمون بھی کم ہوتا جا رہا ہے لیکن خود فلسفہ بھی اسی طرح کی تحدید کے ساتھ تھا۔

اسی وجہ سے شناخت کا مسئلہ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ فکری تشخص میں دونوں پہلو ہیں فرد کا اور ہمارے اجتماع کا۔ جو فرد کا ہے اس میں فرد کی شخصیت تربیت سے بنتی ہے اور تربیت کو ہم

یہ سمجھتے ہیں کہ چند اصول ہیں اگر وہ ہم کو بتا دیے جائیں یا لکھ دیے جائیں یا اس کے پوسٹر لگا دیے جائیں تو اس سے تربیت مکمل ہو جاتی ہے۔ میرے خیال میں تربیت کے دو پہلو ہیں۔ ایک سماجی تنظیم (Social Construction) ہے جس میں آپ اس کو ایک بات بار بار دہرا کر اس کو عملی طور پر روزانہ تجربے میں سے گزار کر اس چیز کو جو تصور ہے، حقیقت بناتے ہیں۔ مثلاً وقت کی پابندی کا تصور ہے جب آپ کہتے ہیں کہ نو بجے آنا ہے اور نو بج کر پانچ منٹ پر فلاں سے ملاقات ہے تو آپ وقت کی سماجی تنظیم کر رہے ہیں جس کا اس سے پہلے کوئی تصور نہیں تھا۔ وقت جدید دور کا بہت بنیادی نقطہ ہے، ہمارے ہاں وقت کا تصور چونکہ نہیں تھا، اس لیے علمیات میں کسی چیز کی تاریخ نہیں ہے۔ ہر چیز بیک وقت آتی ہے اور بیک وقت رہتی ہے۔ ہمارے ذہن میں جب یہ بات آتی ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم تھے رسول اللہؐ تھے، آئمہ کرام تھے، یہ سارا کوئی ایسا وقت تھا جس میں سارے تھے، حالانکہ یہ سارے مختلف وقتوں میں تھے۔ یہ ارتقائی مراحل ہیں۔ وہ مراحل جو ہمارے سامنے نہیں گزرے، ہم سمجھتے ہیں یہ ہوا ہی نہیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جیسا رسول اللہؐ کے زمانے میں تھا ویسا ہی اب تک چلا آ رہا ہے۔ تو یہ وقت کا مسئلہ ہے۔ اس میں بھی ہمارا تصور یہ ہے کہ پچھلا وقت زیادہ بہتر تھا اور اگلا وقت برا آنے والا ہے۔ یہ تصور جدت کو چیلنج کر رہا ہے اور اس جدت کے لیے ہم جو چیز تربیت میں لائے ہیں، اس میں اس کا احساس نہیں ہے لیکن 'سیریل ٹائم' کا احساس آ گیا ہے۔ یعنی دن ہوتا ہے، رات ہوتی ہے، دوپہر ہوتی ہے، بیس منٹ ہوتے ہیں، یہ تقسیم تو ہمارے ذہن میں آ گئی ہے لیکن وقت کی اپنی حیثیت، اپنی اہمیت، ابھی نہیں آئی۔ لیکن اس کا نقصان ہماری روایت کے تصور پر اس کا اثر ہے۔ ہم یہ نہیں سمجھتے کہ اس میں تبدیلیاں آئی ہیں۔ ہمارے ہاں تسلسل کا تصور اتنا مضبوط ہے کہ وہ تبدیلیاں جو آئی بھی ہیں انھیں یا تو مرتب کرتے ہوئے حذف کر دیا گیا ہے یا ان کو ایک طرف کر دیا گیا ہے۔ سو ہم جب اپنی تاریخ پڑھتے ہیں یا مضامین پڑھتے ہیں تو اس میں جو تبدیلی کا تصور ہے وہ نہیں ہے۔ اپنی زندگی میں ہی مطلب ساٹھ ستر سال میں اتنی تبدیلیاں میں نے اپنی عمر میں دیکھیں ہیں کہ اتنی شاید پہلے تاریخ میں نظر نہ

آئیں۔ ہر سال کوئی نہ کوئی چیز بدل رہی ہے، ماڈل بدل رہے ہیں، آپ ایک چیز کے عادی ہوتے ہیں تو وہ بدل جاتی ہے، پہلے آپ ان پیج کے عادی تھے پھر ایم ایس ورڈ آ گیا۔ ایک پروگرام ختم ہو جاتا ہے، اس کے بعد دوسرا آ جاتا ہے۔ یہ جو تبدیلی کا عمل ہے جب تک آپ ذہنی طور پر اس کے لیے تیار نہ ہوں، اسے قبول نہیں کرتے۔ میں بات کر رہا تھا کہ سماجی تنظیم کی تربیت میں ہمیں اگر یہ احساس ہو کہ یہ حقائق ہیں، ایسے حقائق جو سماجی تنظیم کے تحت ہیں تو اس کو آپ لوگوں کی عادت بنوائیں گے۔ سچ بولنا، جھوٹ بولنا، ایک تو کتبے پہ لکھا ہوا ہے، دوسرے آپ اس کی سماجی تنظیم بھی کریں گے۔ صبح سے شام تک بار بار آپ کو پتہ چلے گا کہ یہ بری چیز ہے۔ جب تک آپ اس کو سماجی تنظیم کے عمل کے تحت نہیں لاتے وہ فرد کی تربیت میں نہیں آتا، وہ فرد کی طبیعت میں نہیں آتا، فرد کی عادت نہیں بنتی۔

دوسری چیز جو تربیت میں ہے وہ یہ ہے کہ جب فرد اس کو حقیقت سمجھنے لگتا ہے تو پھر اس کی اپنی سوچ کی ملکیت والی حیثیت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ فرد کو اس کا بھی احساس ہونا چاہیے کہ یہ سماجی تنظیم کا ایک عمل ہے، یہ تبدیل بھی ہو سکتا ہے کیونکہ آپ اگر اسے یہ نہیں کہیں گے تو پھر آئندہ جب بھی تبدیلی آئے گی وہ اس کو روکے گا اور اس سے خود بھی رکے گا۔ تو سماجی تنظیم میں سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ یہ کوئی آسمانی چیز نہیں ہے۔ ہم نے یعنی خود معاشرے نے اس کا فیصلہ کیا ہے اور معاشرہ ہی اس کو بھگت رہا ہے اور یہ کوئی ایسی حقیقت اب بھی نہیں ہے، جو ہمیشہ کے لیے ہے۔ ہم عام طور پر نصاب یا طریق تدریس کی بات کرتے ہیں اور اور اس میں عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ابدی اقدار ہیں۔ اگر ہم یہ ذہن میں رکھیں کہ یہ ہماری پیدا کردہ ہیں، اس کو معاشرے کی سماجی تنظیم کی غرض سے اجماع نے اکٹھے ہو کر مان لیا ہے۔ لیکن زبان میں بھی جب کوئی نئے لفظ آتے ہیں تو ان کے خلاف ردعمل آتا ہے، آہستہ آہستہ وہ لفظ زبان کا حصہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر آپ ایسی زبان بولتے ہیں جس کو دوسرے نہیں سمجھتے تو انفرادی زبان، زبان نہیں ہوتی جب تک دوسرے آپ کو سمجھ نہ رہے ہوں۔ سماجی تنظیم کا عمل آپ کے ساتھ آپ کی زندگی میں چلتا

ہے۔ یہ پہلو اگر ہم ذہن میں رکھیں تو بہت سے جو مسائل مذہب کے بارے میں، فقہ کے بارے میں اور دوسرے علوم میں پیدا ہوتے ہیں ان کو ہم آسانی سے سمجھ سکیں گے۔ یہ سماجی تنظیم کے تحت پیدا ہوئے علوم ہیں، معلومات ہیں جو ہمارے پاس ہیں۔ یہ اس زمانے کی سماجی تنظیم ہے جو ہم تک پہنچی ہے۔ اس میں تبدیلیاں بھی آتی رہیں اور اب بھی تبدیلیاں آ رہی ہیں۔ ہم بھی تبدیلی سے گزر رہے ہیں تو وہ بھی جس کو ہم بحران سمجھ کے پریشان ہوتے ہیں، اس کو کافی حد تک ہم کنٹرول کر سکیں گے اور اس میں ہمیں یہ امید بھی ہوگی کہ ہم اس بحران کو سامنا بھی کر سکیں گے۔ فرد کو سماجی تنظیم کے عمل سے گزارنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو ایسا بنایا جائے کہ وہ اپنی انفرادی حیثیت کو بھی رکھے لیکن معاشرے کے ساتھ اس کے روابط بھی رہیں اور معاشرے کے ساتھ اس کا میل جول بھی رہے اس کا رہن سہن گھر والوں کے ساتھ خاندان والوں کے ساتھ مدرسے کے لوگوں کے ساتھ دوسرے لوگوں کے ساتھ قائم رہے اور اس کے لیے اس کی تربیت بھی ہوتی رہے۔ یہ ایک معاشرے کے اپنے تصورات ہوتے ہیں۔ اگر اس کو آپ شعوری طور پر کر رہے ہیں تو اس میں آپ کو پتہ ہوتا ہے کہ یہ کیا ہے اور اگر آپ غیر شعوری پر کر رہے ہوتے ہیں تو وہ روایت بن جاتی یہ اور اس کو آگے تبدیلی نہیں آتی اور جہاں ذرا تبدیلی ہو جائے آپ پریشان ہو جاتے ہیں۔

اس میں جو استاد اور تعلیم کا کردار ہے، وہ دو طرح کا ہے۔ ایک یہ معلومات آ رہی ہیں ان کے بارے میں جو سوال بار بار اٹھتا ہے وہ یہ کہ یہ مستند ہے کہ نہیں ہے۔ مستند کیا ہے اس کی تعریف بھی بدلتی رہتی ہے لیکن آپ کو اس میں بتانا ہوگا کہ مستند اور غیر مستند میں فرق کریں۔ سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ آپ کو وہم و تذبذب میں ڈال رہا ہے کیونکہ وہ ایک منظم یا کوئی نظریاتی چیز نہیں ہے بلکہ ہر شخص اس میں اپنی معلومات دے رہا ہے۔ یوں سمجھیے کہ ایک انفرادی طور پر مکالمہ ہو رہا ہے۔ اس میں کچھ لوگوں کے نزدیک یہ چیز مستند ہے کچھ کے نزدیک نہیں۔ ہمارے ہاں جو رویہ ہے اس میں ہم مار اس لیے کھا رہے ہیں کہ جوں جوں چیز آتی ہے ہم اس کو فوراً شیئر کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

بغیر تحقیق کیے کہ یہ مستند ہے کہ نہیں ہے۔ استناد جانچنے کے لیے بھی زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہوتی بعض دفعہ آپ اسی انٹرنیٹ پر اسی پیج پر جہاں وہ چیز موجود ہے آپ اسے دیکھ سکتے ہیں کہ مستند ہے کہ جعلی ہے، اس کے لیے تربیت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس وقت مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں ایک خاص رجحان کی وجہ سے ایک پریشانی ہوتی ہے اس میں ہمیں کوئی چیز اچھی لگی جو ہم سوچ رہے تھے یہ بالکل ویسا ہی ہے ہم فوراً اس کو شیئر کرتے ہیں اور لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور پاکستان میں ہم جس مسئلے سے دوچار ہیں اس میں یہ سوشل میڈیا کی وجہ سے بہت سی چیزیں ہمارے سامنے آ رہی ہیں۔

معلم کا کردار ایک تو یہ ہے کہ طلبہ کو بتائے کیا چیز مستند ہوتی ہے کیا غیر مستند ہوتی ہے، کس وقت مستند ہوتی ہے، کس وقت کون سی کام آتی ہے اور کیوں فیک ہو رہی ہے، کون اس کو استعمال کر رہا ہے۔ ان کو اگر معلم کسی طرح بتا سکے اور بتانا باہر کے ملکوں میں تو ہائی سکول سے شروع ہو جاتا ہے لیکن ہمارے ہاں کم از کم یونیورسٹی کی سطح پر لازم ہونا چاہیے کہ جب آپ مقالہ لکھ رہے ہیں، ریسرچ پیپر لکھ رہے ہیں تو پھر آپ کو پتہ ہو کہ ثانوی ماخذات کے حوالے نہیں دیے جاتے، ان پر بحث نہیں کی جا سکتی۔ اور خاص طور پر وہ ثانوی ماخذات جنہوں نے اپنے اصل ماخذات کا بھی ذکر نہ کیا ہو تو یہ ساری چیزیں ضرورت ہیں کہ ہم سوشل میڈیا سے استفادے میں بھی اور جو اصل علمی روایت ہے اس میں بھی اپنائیں۔ میں تفصیل میں نہیں جاؤں گا کہ ہمارے ہاں اسلام میں علمی روایت کتنی سخت رہی ہے۔ میں صرف اس کی ایک مثال ذکر کروں گا۔ آپ اندازہ کریں کہ انتہائی مذہبی معاشرہ ہے، انتہائی مذہبی ماحول ہے، اس میں ایک شخص کہتا ہے کہ رسول اللہؐ سے حدیث میں نے سنی ہے۔ ہمارے محدثین کا یہ ماننا ہے کہ یہ کہنے سے کافی نہیں ہے جب تک آپ اس کو تحقیق تفتیش کر کے ثابت نہ کر سکیں کہ حدیث ہے۔ بہت بڑی بات ہے کہ آپ کو ایک معلومات مل رہی ہے اور اس میں رسول اللہؐ کا نام بھی آ رہا ہے لیکن آپ اس کو بھی فوری قبول نہیں کر رہے۔ تو یہ جو روایت ہے اس کو ہم نے چھوڑ دیا ہے اس میں ایک بات اور بھی کہتا جاؤں کہ حدیث خود بڑی اہم

چیز ہے اور محدثین نے اس پر بڑی محنت بھی کی ہے۔ تحقیق اور تفتیش کے اندر آپ اندازہ کریں کہ ہم ساتویں صدی کی بات کر رہے ہیں۔ اتنی تحقیق و تفتیش کو کتنی دیر لگی ہے لیکن اس وقت ان لوگوں نے ان کے حالات زندگی وہ مل سکتے تھے یا نہیں مل سکتے تھے زبان کیسی ہے یہ سارے معیار اس وقت رکھے۔ اس کے باوجود جو حدیث کے مجموعے ہیں ان میں حدیث اپنے پورے تناظر میں نقل نہیں ہو رہی۔ رسول اللہؐ نے فرمایا تو وہ واقعہ بیان نہیں ہو رہا کہ کس وقت فرمایا اس کا کیا تعلق تھا بلکہ حدیث والے مختلف ابواب میں ایک ہی واقعے کو کئی جگہ ذکر کیا ہے ٹکڑے ٹکڑے کر کے۔ کہیں اس کا کوئی ٹکڑا مثلاً ایک ہے کہ میاں بیوی سے بات کیسے کریں اس میں وہ تعلق رکھتا ہے وہ ٹکڑا وہاں ڈال دیا، آگے ہے کہ جنگ کے حالات ہوں تو پھر کیا ہو، وہ اس میں ڈال دیا تو اب ہمارے لیے یہ مشکل ہے کہ حدیث بذات خود کتنی مستند، کتنی اہم ہو لیکن جب تک آپ اس پورے واقعے کو سامنے نہیں رکھیں گے اس وقت تک آپ کو صحیح پتہ نہیں چلے گا اور اس وقت ایک بات اور بھی ہے کہ اس وقت جو حدیثیں ان مجموعوں میں ہیں ان میں سے بھی لوگ ٹکڑے لے کر لگاتے ہیں جو ان کے مؤقف کی تائید کر رہے ہوتے ہیں۔ اگر آپ اس کا اگلا فقرہ جو رسول اللہؐ نے فرمایا، اس کے ساتھ لے لیں تو پھر اس کے معنی بدل جاتے ہیں۔

میں یہ صرف اس لیے کہہ رہا ہوں کہ یہ جو تربیت ہے یہ ہم نے فرد کی کرنی تھی اور ہماری تعلیم نے کرنی تھی وہ ہم نہیں کر پا رہے۔ اس کی بہت سی وجوہات ہیں ان کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا لیکن اس کی ایک بڑی وجہ یہ کہ تعلیم کا مطلب ہم نے یہ سمجھا کہ ایک نسل سے دوسری نسل تک معلومات منتقل کریں۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ ہماری تعلیم کا مقصد یہ ہوتا کہ طالب علم کی علمی و فکری ذہن سازی (Intellectual formation) کرتے۔ یہ بتاتے کہ عقل کا استعمال کیسے کرنا ہے اور وہ سوچے کیسے؟ چیزوں میں کیسے فرق کرے؟ اس نہج پر ذہن سازی بہت ضروری تھی۔ ہمارے ہاں چونکہ روایت کی حفاظت پر زیادہ زور رہا تو فکری ذہن سازی کی عام طور پر حوصلہ شکنی کی گئی۔ ہماری روایات میں سوال کرنے کے لیے بہت سی تمہید معذرت کے طور پر کرنی پڑتی ہے اس

کے بعد آپ سوال کرتے ہیں۔ تو جو لوگ ایسے تھے جنہوں نے اپنے وقت میں ان چیزوں پر سوال کھل کے کیا، ان کو ہم نے ایک طرف کر دیا لیکن اب ان کی اہمیت ہے۔ ان میں سے مثلاً ابن حزم کا آج کل بہت زیادہ حوالہ دیا جا رہا ہے، ابن تیمیہ اپنے وقت میں برے سمجھے جاتے تھے لیکن انھوں نے ہر ایک کو سوالات کیے ہر ایک پر تنقید کی تو یہ فکری ذہن سازی ہے، اس کی اہمیت ابھی تک ہماری روایت میں نہیں ہے لیکن باقی جگہ پر ہے۔ میں اس کو ایک دفعہ پھر بیان کر دوں کہ ہمارا جو فرد کے ساتھ تعلیمی کردار ہے تعلیمی مقصد ہے ایک تو اس میں کھرے اور کھوٹے کی تمیز پیدا کرنا اور دوسرا اس میں تعقل کا کہ وہ اپنے مسائل کو سوچنے کا تجزیہ کرنے کا اہل ہوتا کہ وہ اس کو پوری طرح سمجھ سکے۔

تیسری چیز تھی تحقیق کا طریقہ کیا ہوگا۔ ہمارے ہاں عام طور پر جو طریقہ استعمال ہوا وہ استخراج کا تھا کہ آپ کے پاس جو متن ہے، جو آپ کے پاس فارمولا ہے اس کا آگے اطلاق یا نفاذ کرنا ہے۔ اسلامی روایت میں دونوں چیزیں ہیں لیکن ہمارے ہاں زیادہ اہمیت استخراج کو رہی۔ جو انڈکشن یا استقرا ہے وہ بھی موجود ہے، قرآن مجید میں بھی اس پر زور ہے کہ آپ ایک دلیل یا سند سے نتیجے پر نہیں پہنچتے بلکہ مختلف دلائل سے۔ قرآن مجید کی بھی ایک آیت سے نہیں بلکہ ساری آیتوں سے جو استقرا کا طریقہ ہے یہ ہمارے ہاں چلا آ رہا تھا لیکن چودھویں صدی سے اس پر زیادہ زور ہوا۔ ہمارا جو زیادہ تر فقہ کا مسئلہ ہے وہ قیاس پر ہے، قیاس کا مطلب استخراج کا ہے۔ اس میں یہ ہے کہ آپ تین طریق کار اپناتے ہیں۔ پہلا پراسس جنگل اسٹیٹمنٹ ہوتی ہے اس کے بعد اگلی اسٹیٹمنٹ میں آپ اپنا مسئلہ دیتے ہیں، اس کے برعکس دوسرا طریقہ استقرا کا ہے کہ آپ مختلف مصادر میں سے، چاہے وہ آیات ہیں، متن ہیں، تجربے ہیں، یا مختلف حالات ہیں ان سب کو اکٹھا کر کے پھر ان میں سے دیکھتے ہیں کہ کون سی چیز اس میں مستقل اور متواتر ہے یعنی کون سی چیز اس سب میں شامل ہے۔ تو وہ استقرا کا طریقہ ہے۔ جدید دور میں اس پر زیادہ کام ہونا شروع ہوا ہے اور بہت سی سائنسز کی ترقی بھی اس کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اس میں بھی جو مسئلہ ہے وہ اس وقت اب سامنے

آ رہا ہے، وہ یہ ہے کو جو استقرائی طریق کار استعمال ہوگا چاہے وہ سائیکالوجی ہے یا سائنسز ہیں، اس میں ''کنٹرولڈ انوائرمنٹ'' کے اندر اس کا استقرا کیا جاتا ہے۔ اب ہمیں ضرورت ہے کہ متعدد نقطہ ہائے نظر کے تنوع کو بھی پیشِ نظر رکھیں۔ ہم نے تنوع کو دو صدیوں تک اہمیت نہیں دی۔ اب وہ ہمارے منہ پر آ رہی ہے کہ ہماری منطق متعدد مصادر اور متعدد علتوں کو پیشِ نظر نہیں رکھتی تو یہ ایک نیا مسئلہ شروع ہو گیا۔ لیکن اگر ان کا شعور ہم طلبہ تک منتقل کر سکیں تو پھر ہمارے لیے یہ آسانی ہوگی کہ ہم بہت سے بحرانوں سے فکری طور پر چیلنجز سے نمٹنے کے لیے تیار ہوں گے۔ تشخص کی تربیت فرد کے حساب سے ہے جو قومی طور پر ہم نے زور دیا ہے۔ اس میں جیسے فرد کا ایک مقام ہے اس طرح قوموں کا بھی ہے، اس میں تاریخ کی اہمیت ہے۔ آپ کہاں ہیں؟ آپ کی گذشتہ تاریخ کیا ہے؟ آپ کا جغرافیہ کیا ہے؟ تو پاکستان کی قومیت کا جو مسئلہ ہے اس میں ہمارے یہ سارے پہلو ابھی تک ان پر سوال چل رہے ہیں آپ کون سے علاقے میں ہیں؟ آپ کہاں سے شروع ہوتے ہیں؟ ہمارا ایک تو وہ طبقہ ہے جو اس کو شروع کرتا ہے حضرت آدمؑ سے اور باقی شروع کرتے ہیں رسول اللہؐ سے۔ اس سے اگلے شروع کرتے ہیں جماعت اسلامی سے، مطلب اب یہ جو تاریخ ہے وہ بھی ہر ایک نے اپنے اپنے حساب سے بنالی ہے۔ جغرافیہ میں ہم جہاں ہیں اس کا تعلق نہیں، ہم امت مسلمہ سے جوڑتے ہیں، اسپین سے جوڑتے ہیں، سسلی سے جوڑتے ہیں، لیکن پڑوس میں افغانستان ہے، ہندوستان ہے، ایران ہے وہ ہماری تاریخ کا حصہ بنانے میں ہمیں مشکلیں پیش آ رہی ہیں۔ تو یہ تاریخ اور جغرافیہ میں زمان و مکان ہے یہ آدمی کے تشخص کے دو حوالے ہیں۔ جب ہم اس کا احساس نہیں کریں گے تو اس وقت تک ہم اپنا تشخص نہیں بنا سکتے، وہ بدلتا رہے گا۔

پاکستان جس وقت بنا اس وقت پاکستان کے مسائل وہ نہیں تھے جو پاکستان کی تحریک کے وقت پیش کیے گئے۔ مسلم لیگ نے پاکستان کی تحریک جو شروع کی، وہ علاقے جن میں پاکستان بنا ہے سوائے مشرقی پاکستان کے، جو اب بنگلہ دیش ہے، ان علاقوں میں یہ تحریک اتنی زیادہ طاقت ور

نہیں تھی۔ ان علاقوں کے مسائل بالکل مختلف تھے، یہاں اسلام کے حوالے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ مسلمان تھے اور مسلمان رہیں گے لیکن ہم نے مسلمان کا، اسلام کا سوال اٹھایا، یہاں ایک نیا مسئلہ ان کو دے دیا۔ یہاں لسانی مسئلے تھے، زمین کے مسئلے تھے، ثقافت کے مسئلے تھے، ان مسئلوں کو ہم نے حل کرنے کے لیے یہی کوشش کی کہ کہیں کہ یہ سب مسلمان ہیں، بھائی بھائی ہیں، ان باتوں کو چھوڑیں۔ ان باتوں پر ہم نے توجہ نہیں دی۔ اب وہ ہمارے لیے مسئلہ بن کے آ رہی ہیں۔ ہم نے جو مقام تلاش کرنا تھا، وہ امت مسلمہ میں تلاش کیا۔ یہ بہت اچھا تھا، لیکن ہم جنوبی ایشیا میں تھے، ہم ایشیا میں تھے، ہم نے مقابلہ کیا یورپ کی تاریخ سے، مقابلہ کیا امریکا کی تاریخ سے اور تعلق رکھا شمالی افریقہ کے مسلمانوں سے، سعودی عربیہ سے، وسط ایشیا سے۔ ان علاقوں میں ہم نے یعنی مسلمانوں نے جتنے برس حکومت کی ہے، اگر آپ فتاویٰ عالمگیر یہ دیکھیں اس میں بہت کم ذکر آئے گا کہ ہندوؤں کے ساتھ آپ نے کیسے گزارا کرنا ہے؟ بدھوں کے ساتھ کیسے گزارنا کرنا ہے؟ تو ہم جہاں سے گئے سرسری گزرتے رہے اور وہ جو علاقہ ہے اس سے ہمارا تعلق ٹھوس نہیں ہوا۔ تو یہ اب ہمارے سامنے آ رہا ہے اور اس وقت تو بہت زیادہ ہے اور آئندہ تو اس سے بھی زیادہ تفصیلی ہوگا کہ ہمارا جو پچھلا رویہ ہے اب نہیں چلے گا۔

اسی تشخص کے حوالہ سے ایک پہلو اور بھی آپ کے سامنے رکھ دوں اور وہ ہے تصور اقلیت کا۔ ہم نے زیادہ تر بطور مسلمان جو ہمارے بہت بڑے کارنامے ہیں وہ ان علاقوں میں ہیں جہاں ہم اقلیت کے طور پر تھے، جیسے برصغیر ہے، اسپین ہے اور وہاں ہم نے جو فلسفہ اس کا بنایا وہ فلسفہ وہی تھا جو کہ اکثریتی علاقوں کا تھا کہ ہم غلبے میں ہیں۔ ہم حکمران ہیں تو یہ غلبہ ہمیں حاصل ہے پھر ہم نے اپنی خصوصیات میں اس غلبے کو شامل کیا ہوا ہے کہ ہم غلبے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کسی اور کی حکومت میں مسلمان رہ سکیں اور وہ ہم نے اس طرح سے سوچا ہے کہ یا تو اس علاقے سے ہم نکل جائیں، ہجرت کریں، اس علاقے کو چھوڑ کر یا پھر اسے مسلمان بنائیں۔ یہ جو غلبے کی خصوصیت ہم نے اپنے ساتھ پیدا کی، اس میں ہم نے یہ نہیں سوچا کہ جس علاقے میں ہم رہ

رہیں اس میں دوسرے لوگ بھی رہ رہے ہیں جہاں ان کو اقلیت کہتے ہیں ان کے بھی مسائل ہیں ان کے ساتھ کیسے ہم نے رہنا ہے۔ یہ ہم نے ایک معلق قسم کی اپنی فکر بنائی۔ اس کا مسئلہ ہمیں بار بار آ رہا ہے۔ پھر یہ کہ غلبے کے لیے سرسید نے راستے دیے تھے، وہ یہ کہ آپ علم میں اپنے آپ کو مضبوط کریں اور علم کو جو غلبہ ہے، علم کی جو پہچان ہے اس میں آپ مقبول ہوں۔ اس کی بجائے ہم نے جہاد اور جنگ کو اور مقابلے کو اور طاقت کے استعمال کو زیادہ اہمیت دی۔ طاقت ہماری آئیڈیالوجی اور مذہب کا حصہ بن گئی۔ اس سوچ کی وجہ سے پھر اس کی وجہ سے طاقت اور غلبے کے لیے اخلاقیات پر سمجھوتا ہوتا رہا۔ مذہبی آدمی کے لیے اخلاقیات بنیادی ہوتی ہے کہ وہ اس کے لیے نقصان بھی برداشت کر سکتا ہے وہ اس کے لیے جان بھی دے سکتا ہے لیکن جھوٹ نہیں بولے گا۔ اس پر ہم نے سمجھوتا کیا اور اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔

یہ میں صرف اندازے کے طور پر کہ ہمارا فکری چیلنج کس طرح وسیع ہے، کس طرح اس کے پہلو ہیں میں آپ کے سامنے تین تحریکوں کا ذکر کروں گا جو اسلامی دنیا میں چلیں، اور تینوں کی بنیاد برصغیر میں ہی ہے۔ یہ تین تحریکیں ہیں کہ علم کیسے ہے؟ ہمارا تصورِ دنیا کیا ہوگا؟ اور اسلام کی تعبیر کیسے ہوگی؟ تینوں تحریکوں کا بنیادی مسئلہ یہی ہے۔ فکری چیلنج کو سمجھنے کے لیے آپ ان تحریکوں کو سمجھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہم نے کیسے ڈیل کیا۔ ایک تحریک اسلامی جدیدیت کی ہے جو سرسید سے شروع ہوئی ہے اور سرسید کے بعد اور لوگ بھی آئے اور اس میں تبدیلیاں آتی رہی ہیں۔ میں بہت مختصر عرض کروں گا، سرسید کا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے اسلامی روایات کو اور اس نے جدیدیت کو دیکھا تو اس نے کہا کہ ہماری کمزوری کی وجہ ہمارا علم الکلام ہے۔ یہ علم الکلام جدید علمی چیلنج کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ مختصراً یہ کہ ہمارا علم الکلام، یونانیوں کے علوم کی وجہ سے جو مسائل پیدا ہوئے اس وقت ان کے جواب کے لیے تیار ہوا تھا۔ اس کے جواب میں تیار کرتے ہوئے ہم نے یونانی فلسفہ یونانی منطق اور یونانی میں کس طرح استدلال کریں گے، اس پر اس کی بنیاد رکھی۔ اس میں علم الکلام میں مذہبی عقائد کا دفاع کرنا تھا لیکن اس دفاع کے لیے جو ہتھیار بنائے وہ اسی علم سے

بنائے جو یونانی تھا اور وہ قرونِ وسطیٰ تک چونکہ چیلنج نہیں ہوئے تھے تو ان سے کام چلتا رہا۔ تھوڑی بہت تبدیلیاں آتی ہیں لیکن جدید دور میں جہاں استدلال علم بالکل ہی مردہ ہو گیا، اب آپ کو اس کی ضرورت نہیں تھی تو اس وقت یہ کام نہیں کر رہا تھا، چنانچہ بہت سے مسائل پیدا ہوئے۔ ان میں سرسید نے معجزے کے تصور کا ذکر کیا، ابدیت کے تصور کا ذکر کیا، تو انہوں نے کہا کہ ہمیں نئے علم الکلام کی ضرورت ہے۔ اس نئے علم الکلام میں ہمارے سامنے جو سوال آئے گا اگر آپ پرانے علم الکلام کو ہی سامنے رکھتے ہیں تو یا تو سائنس کو مطلقاً مسترد کریں یا مطلقاً قبول کریں، تیسرا طریقہ یہ ہے کہ ہم اس میں تیسرا راستہ نکالیں جس میں ہم سائنس کی اپنے عقائد کے ساتھ مطابقت پیدا کرتے ہوئے ایک نیا علم الکلام بنائیں۔

اس میں انہوں نے اجتہاد کی طرف توجہ دلائی اور تعلیمات میں جو علم کا تصور ہے اس میں جو بنیادی سوال ہے کہ تسلسل اور تواتر کو اہمیت ہے، لیکن اصل چیز جس پہ غور کرنا وہ چیلنج ہے۔ اس اسلامی جدیدیت کی سرسید کے زمانے میں ہی بہت سخت مخالفت ہوئی۔ خاص طور پر جمال الدین افغانی کی طرف سے جو فتویٰ آیا، سرسید کے خلاف آیا، پھر علماء کے فتاویٰ آئے، تو یہ اپنے زمانے میں ہی یہ تحریک تقریباً مسترد ہو گئی لیکن چونکہ اس کا علمی زور بہت تھا تو یہ چلتی رہی، پھر علامہ اقبال اور دوسرے لوگ آئے۔ یہ تحریک اخیر میں ختم ہوئی جو دوسری ایک تحریک اس کے مقابلے میں آئی وہ سیاسی اسلام کی تھی۔

سیاسی اسلام کی بنیاد بھی اسی استعماری دور میں پڑی۔ اس کی بنیاد یہ تھی کہ ہمیں جو شکست ہوئی ہے وہ سیاسی زوال کی وجہ سے ہوئی ہے اور اس کا جواب یہ ہے کہ ہم اپنا سیاسی اقتدار بحال کریں۔ جب خلافت عثمانیہ کا خاتمہ ہوا تو یہ خلافت عثمانیہ کی بحالی کی تحریک بنی 1929ء سے 1934ء تک، جب وہ مسئلہ بھی ختم ہو گیا اور آزادی کی قومی تحریکیں شروع ہو گئیں تو پھر ان قومی تحریکوں کے ساتھ یہ مسئلہ آیا کہ قومی ریاست ایسی ہونی چاہیے کہ جو اسلام کے سیاسی اقتدار کو بحال کر سکے۔ اس کے لیے مولانا مودودی کی فکر میں جو دو نکات اہم ہیں وہ یہ کہ اللہ کی حاکمیت اور

شریعت کی برتری، یہ تصورات ان کی اسلامی سیاسی فکر کی بنیاد تھے۔ یہ تصورات پھر برصغیر سے عالم اسلام میں بھی گئے، دیگر تحریکوں میں یہ چیزیں نہیں ملتیں، جمال الدین افغانی کی تحریک میں بھی نہیں ملتی۔ سیاسی اسلام کی تحریک بہت مؤثر تھی اور یہ بہت غالب ہوئی۔ اس نے اسلامی جدیدیت کی تحریک کو بھی تقریباً ختم کر دیا، جماعت اسلامی اور خاص طور پر دیو بند کے لوگ ہندوستان میں جو رہ گئے وہ مسلم لیگ کے ساتھ نہیں تھے، پاکستان کی تحریک کے ساتھ نہیں تھے۔ وہ کانگریسی سیکولرازم میں مسلمانوں کی بہتری سمجھتے تھے۔ پاکستان میں جو یہ دو مختلف ٹکراؤ تھے اور جو مذہبی تحریکیں تھیں، وہ سب اکٹھے ہو کے آہستہ آہستہ پھر سیاسی اسلام کا حصہ بن گئیں۔ سیاسی اسلام کا حصہ اس طرح بنیں کہ جو آئین سازی ہے اس میں تاخیر کی سب سے بڑی وجہ بھی یہی تھی کہ اس کا ڈھانچہ کیسے بنایا جائے کیونکہ اسلامی ریاست کا قیام ہے یا سیکولر کا یا مسلم ریاست کا۔ ریاست کیسی ہوگی؟ اس مسئلے پر تقریباً سب کا یہ کہنا تھا کہ چونکہ اکثریت اس میں مسلمانوں کی ہے اس لیے ریاست کو مسلم یا اسلامی ہی ہونا ہے اور ہماری قرارداد مقاصد میں یہ بات آ گئی۔

قرارداد مقاصد سے پہلے قرارداد لاہور تھی، جس میں مسلمانوں کے لیے بطور اقلیت حفاظت پر زور ہے، مسلمانوں کی آزادی پر زور ہے، ان کی اپنی حکومت پر زور ہے لیکن بطور اقلیت برصغیر میں ان کی بقاء نہ ہونے پر زور ہے۔ قرارداد مقاصد بالکل مثبت ہو جاتی ہے جس میں اللہ کی حاکمیت اور شریعت کی برتری کی بہت مؤثر اور خوبصورت بات ہے لیکن اس میں مسائل تھے، اور اتنے تھے کہ یہ ایک ناممکن الحصول چیز بن گئی۔ اللہ کی حاکمیت میں سب سے پہلا سوال یہ تھا کہ اللہ کا نمائندہ کون ہے؟ اور اللہ کی حاکمیت کا جو غیر واضح اور مبہم معنی تھا وہ یہ کہ علما نمائندہ ہیں، یعنی اگر اللہ کی حاکمیت ہے تو مذہب کی حاکمیت ہوگی، مذہب کی ہوگی تو اہلِ مذہب کی ہوگی۔ اس بات کو کھل کر نہیں کہا گیا، اس کی چپقلش اسی طرح رہی۔ شریعت کی برتری کا مطلب یہ تھا کہ یہاں جو اللہ کا قانون ہے وہ رائج ہوگا۔ اب اللہ کا قانون کون سا ہے قرآن مجید ہے، حدیث ہے، فقہ، لیکن پاکستان میں کہا نہیں گیا لیکن سمجھا یا گیا وہ یہ کہ فرقہ ہے، حنفی فرقہ، شیعہ فرقہ ہے، کونسا فرقہ ہے؟

بدقسمتی سے شریعت کا مطلب فرقہ واریت ہوگئی اور اللہ کی حاکمیت کا مطلب علماء کی حکومت ہوگی۔ یہ جو اس کی تفصیل بنی ہماری سیاسی سرگرمیوں میں اس کی وجہ سے مسائل اس وقت تو پیدا نہیں ہوئے لیکن یہ مسائل اب ہمارے 1990ء کے بعد سے اب بہت واضح طور پر سامنے آئے کہ جتنی بھی مذہبی تحریکیں ہیں اور فرقہ واریت میں جو غلبے والی اسکیم تھی، جو جہاد والی اسکیم تھی وہ مسلمانوں کی آپس میں لڑنے والی اسکیمیں بن گئیں۔ تو یہ ہماری ساری دہشت گردی کی تحریکیں آپ دیکھیں عام طور پر انہوں نے مسلمانوں کو ہی کمزور کیا۔ یہ بہت جلد ناکام ہوگئی لیکن اس تحریک کی ناکامی کی وجہ سے سیاسی اسلام کی جو تحریک تھی وہ علمی نہ رہی صرف سیاسی ہوگئی اور اس سیاسی رہ جانے کی وجہ سے اگر آپ دیکھیں تو جماعت اسلامی، اخوان اور اس کے بعد پھر القاعدہ پھر اس کے بعد یہ داعش کیونکہ غلبے کا فلسفہ اس میں زیادہ آ گئی۔

یہ ایک سرسری سا جائزہ تھا کہ آپ دیکھیں کہ اگر ہم ان چیزوں پر توجہ نہیں دیتے، ان چیزوں کو اہمیت نہیں دیتے تو ہم بنیادی طور پر اپنے سیاسی نظام اور نظامِ عدل سے متعلق افراد اور قوم کی جو تربیت کرتے ہیں وہ کسی مقصد کے بغیر اور کسی استعداد کے بغیر کریں تو جو آپ کے سامنے تبدیلیاں آ رہی ہیں، جو مسائل آ رہے ہیں ان کو حل کرنے کی استعداد بھی نہیں ہوتی۔ اور پھر ایک طرح سے فکری کی بجائے بے فکری کا ماحول پیدا ہوتا جاتا ہے۔

اس وقت میں جو آخری وضاحت عرض کروں گا وہ یہ ہے کہ دوسرے بہت سے مسائل میں سے ایک مسئلہ ہمارا سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ کا ہے۔ سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ ہی نہیں ہے بلکہ دو سطحوں پر ایک 'موڈیلٹی' آپ کے سامنے ہے۔ ایک موڈیلٹی ہے جو حکومتوں، ریاست اور اداروں کی طرف سے آ رہی ہے، اور ایک ہے جس کے پیچھے کوئی بھی نظر نہیں آتا وہ خود بخود ہو رہی ہے اور وہ عجیب و غریب طریقے سے آ رہی ہے اور اس نے ہمیں کمزور کیا۔ مسلمان آپس میں بٹے، وہ جو ہدف ان کے ہو سکتے تھے وہ نہیں ہوئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ جدید تحریکیں نہیں بن سکیں اور اسی فلسفے کے اندر رہیں۔

تیسری تحریک جو تھی وہ علوم کی اسلامی تشکیل کی تھی۔ یہ جب چودھویں صدی کا آغاز ہوا 1979ء میں اس وقت یہ تحریک آئی۔ یہ بڑی طاقت ور تحریک تھی لیکن یہ بہت جلد ختم ہوگئی کیونکہ یہ صحیح طور پر نظریۂ علم کی تحریک نہ بنی بلکہ یہ سیاسی تحریک رہی۔ علوم کی تشکیل کا بنیادی جو مقدمہ تھا وہ یہ تھا کہ جو مغربی علوم ہیں ان کے پیچھے ان کی تہذیبی سوچ ہے، وہ تہذیبی سوچ مسلمانوں کے لیے مفید نہیں ہے کیونکہ اس کے پیچھے استعمار ہے، اس کے پیچھے اسلام دشمنی ہے وغیرہ وغیرہ۔ علوم کا اسلامی پس منظر ہونا چاہیے، اسلامی تہذیبی اصول ہونے چاہییں، چنانچہ اس کے ساتھ انھوں یہ شروع کیا۔ مکہ مکرمہ میں ان کے تین اجلاس ہوئے جس میں دنیا بھر کی اسلامی یونیورسٹیاں، اور اسلامی کالج بنے اور اس کے ساتھ کتابیں لکھنے کے لیے لوگوں کو کہا گیا۔ اس میں اسلامی سوشیالوجی، اسلامی انگریزی اور سب چیزوں کو اسلامی کرنے کے لیے بات ہوئی لیکن چونکہ سیاسی تحریک زیادہ تھی، علمی کم تھی تو اس مسئلے کو بہت ہی سرسری لیا گیا، واقعی طور پر سوائے چند ایک کتابوں کے کوئی علمی کام نہ ہوا۔

عمومی رویوں میں عدم برداشت

خورشید ندیم

پڑھے لکھے لوگوں کی مجلس میں گفتگو کا ایک فائدہ بہرصورت ہوتا ہے کہ آپ کے نتائج فکر میں اگر کوئی کمزوری ہے تو اس کی نشاندہی ہو جاتی ہے اور اگر صحت کا پہلو ہے تو اس کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ جو اس مجلس کا بنیادی مقصد ہے مکالمہ کہ اپنے نتائج فکر کے ساتھ ایک بہتر حل کی طرف، بہتر نتیجہ کی طرف بڑھنا اس کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور جب ہم نشست کے خاتمے پر یہاں سے اٹھتے ہیں تو ہم سب مطمئن ہوتے ہیں کہ ہم نے کچھ دیا بھی اور کچھ لیا بھی۔ ہماری وجہ سے بھی کسی کو فائدہ پہنچا اور کسی کی وجہ سے ہمیں بھی فائدہ پہنچا۔ جو کچھ کہا گیا جو کچھ یہاں سنا گیا اس کا ایک اجتماعی اثر ہے، تاثر ہے جو اصل میں وہ اثاثہ ہے جو ہم یہاں سے لے کر جا رہے ہیں۔

ایک بات ہم سب میرا خیال ہے کہ طے کر کے آئے ہیں کہ پاکستان کو انتہا پسندی کا چیلنج درپیش ہے۔اس بارے میں دوسری رائے میں امید کرتا ہوں کہ کم ازکم یہاں شرکاء میں نہیں ہے کہ پاکستان میں ہم ایک ایسے ماحول سے گزر رہے ہیں جس میں انسانی رویے انتہا پسندانہ ہو رہے ہیں اوران کی اصلاح کیے بغیراس معاشرے کا قیام،اس معاشرے کی بقااور سلامتی ممکن نہیں ہے۔اسی مفروضے پر میں اپنی بات کا بنیادی ڈھانچہ استوار کرتا ہوں اور کوشش کرتا ہوں کہ ان بنیادی علامات کی نشاندہی کی جائے جواس انتہا پسندی کا باعث بن رہے ہیں اوراگر ہم ان سے اتفاق کریں توان کی اصلاح کے ساتھ ہم آگے بڑھ سکتے ہیں اوراپنے معاشرے کودوبارہ سے ایک اعتدال پرمبنی معاشرہ بناسکتے ہیں۔

سماجی رویے عام طور پر کسی شعوری کوشش کا نتیجہ نہیں ہوتے۔آپ جیسے پڑھے لکھے لوگ تو مستثنیٰ ہیں لیکن سماج کے اندراندرونی سطح پر جب سماجی رویے پروان چڑھتے ہیں تو یوں نہیں ہوتا کہ ایک آدمی طے کرلیتا ہے میرے رویے میں یہ عوامل ہوں گے، یہ اس کے اجزائے ترکیبی ہوں گے اوراس کے بعد میرا رویہ بدل جائے گا بلکہ سماج کے اندروجود میں آنے والا فطری عمل ہے جس سے کچھ نتائج مرتب ہوتے ہیں اورانسانی رویے کی تشکیل میں بنیادی کردارادا کرتے ہیں۔

میں جب یہ دیکھتا ہوں کہ ہمارے اجتماعی رویوں میں انتہا پسندی اورتشدد پسندی کیوں ہے؟ تو میں چندعوامل بیان کرسکتا ہوں۔

پہلا عامل ہمارا سماجی پس منظراور ہمارا نظام اقدار ہے جس میں ہم جنم لیتے اور پروان چڑھتے ہیں۔ایک مذہبی پس منظر ہے، ایک رواج کا پس منظر ہے، ایک تمدن کا پس منظر ہے، جو ہمارا انتخاب نہیں ہے۔ہم جس گھر یا علاقے میں جنم لیتے ہیں اس کی کچھ روایات واقدار ہیں جو موجود ہیں اور ہم ان کو قبول کر کے اپنے رویے میں شامل کر لیتے ہیں۔یہ جیسے میں نے عرض کیا کہ کسی شعوری کوشش کا نتیجہ نہیں ہوتا، یہ جتنا بھی عمل ہے دنیا کے کسی بھی معاشرے میں رہنے والا آدمی یہ اثر قبول کرتا اوراس کو اپنے رویے کا حصہ بناتا ہے۔ہمارے سماجی تصورات میں کچھ چیزیں ایسی

ہیں جو انتہا پسندی کو جنم دیتی ہیں۔

کچھ تصورات ہیں جو ہم نے تلاش کیے ہیں اور جن کو ہم نے اختیار کیا ہے۔مثال کے طور پر ہمارے ہاں ایک غیرت کا تصور ہے جو اپنے سماجی پس منظر کے ساتھ ہم نے ورثے میں پایا ہے۔ اسی طرح سے خاندانی عصبیت نسلی عصبیت کا ایک تصور ہے۔جو ہم اپنے ماحول سے لیتے ہیں اور لاشعوری طور پر ایک برتری کے احساس میں مبتلا ہوتے ہیں۔

ایک اور جو عامل ہمارے رویے کی تشکیل کرتا ہے وہ ہمارا تاریخی شعور ہے۔ہم تاریخ کے بارے میں ایک تصور رکھتے ہیں اوراس میں ہم خیال کرتے ہیں کہ تصادم ناگزیر ہے۔

تیسری چیز مذہب کا تصور، ہم مذہب کو جس طرح سے جانتے اور جس طرح سے اس کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں وہ بنیادی طور پر ایک جذباتی تعلق ہے۔وہ کوئی شعوری اوراصلاح نفس کے تصور سے اٹھا ہوا تصور مذہب نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ مذہب میری عصبیت ہے جیسے خاندانی عصبیتیں ہوتی ہیں۔وہ عصبیتیں تقاضا کرتی ہیں کہ مسلمانوں کے ساتھ جہاں کوئی زیادتی ہوگی میں اس کے لیے کھڑا ہوں گا اس کے لیے لڑوں گا۔اوراگر کہیں کوئی آدمی میرے مذہب پر میری مذہبی شخصیات کے بارے میں کوئی ایسا رویہ اختیار کرتا ہے جو نازیبا ہے جو بداخلاقی پرمبنی ہے تو مجھے یہ حق ہے کہ میں اپنی اس مذہبی عصبیت کے تحت اس کی جان بھی لے سکتا ہوں اور مجھے لینی چاہیے اور یہ میری دینی حمیت کا تقاضا ہے۔چنانچہ جب کوئی آدمی اپنی دینی حمیت میں جان لے لیتا ہے تو میں معاشرے میں اس کو ہیرو بناتا ہوں۔ایک یہ چلتا ہوا جملہ اکثر ہم سنتے ہیں کہ مسلمان جتنا بھی گیا گزرا ہو یہ تو برداشت نہیں کرسکتا کہ اس کے سامنے اس کے مذہب کو گالی دی جائے اور وہ اس کو چھوڑ دے۔چنانچہ میں اس رویے کی پذیرائی کرتا ہوں میں اس کو جو مذہب کے ساتھ جذباتی وابستگی ہے۔یہ عصبیت میرے لیے وہ کسی تزکیہ نفس کا پیغام نہیں ہے، میری کسی شعوری تربیت کا ماخذ نہیں ہے بلکہ میری ایک عصبیت کا نام ہے۔

ایک اور چیز جو میرے رویے کی تشکیل کر رہی ہے ایک تصور انقلاب ہے جو بیسویں صدی

میں دنیا میں آیا۔ مسلمانوں نے یا جس کو آپ اسلامی تحریکیں کہتے ہیں انہوں نے بھی اسی تصور کو اخذ کیا وہ اسلامی انقلاب کے نام سے رائج ہوا۔ یہ ایک جدوجہد ایسی ہے جو خون بہائے بغیر نہیں ہوسکتی۔ یہ جو تصور انقلاب کمیونزم کے نام پر ہوا یا اسلام کے نام پر ہوا اس کے نتیجے میں بھی جو رویے وجود میں آئے وہ انتہا پسندانہ تھے۔ تشدد پر مبنی تھے، تبدیلی کے لیے اپنا بھی اور دوسروں کا بھی خون بہانا اس کا حاصل ٹھہرا۔

ایک اور عامل جو رائج رہا وہ یہ کہ غلبے کی نفسیات بیان کی جائیں۔ آپ اکثر یہ سوال سنتے ہوں گے کہ اکثر علماء کے سامنے یہ سوال کیا جاتا ہے، مجھے بھی ہر جگہ ہوتا ہے کہ دنیا میں مسلمانوں کا غلبہ کیسے ہوگا؟ یہ جو غلبے کی نفسیات ہے یہ تصادم کو جنم دیتی ہیں۔ دنیا میں جتنے سامراج تھے انہوں نے غلبے کی نفسیات سے جنم لیا، برطانوی سامراج، روسی سامراج، امریکی سامراج وہ کیا ہے؟ کیوں انہوں نے دنیا میں فساد پیدا کیا؟ غلبے کی نفسیات کی وجہ سے۔ ساری دنیا میں روس کا غلبہ ہو جائے، وہ نکلے اور پوری دنیا میں تصادم برپا کر دیا۔ آج امریکا کیا کر رہا ہے ساری دنیا میں امریکا کا غلبہ ہو جائے، افغانستان، عراق، شام، پورا مشرق وسطیٰ اس کا مغلوب ہو جائے۔ اس کے نتیجے میں لاکھوں انسانوں کی جانیں جاتی ہیں تو جائیں اس کو اس کی پروا نہیں ہے، امریکا غالب ہونا چاہیے۔ یہ جو غلبے کی نفسیات ہے یہ کسی بھی قوم کے اندر جب آجاتی ہے تو لازماً اس کا شعور اور سماجی رویہ جو ترتیب پاتا ہے وہ تشدد، عدم رواداری اور تصادم پر مبنی ہوتا ہے۔

یہ چند عوامل ہیں جو میرے نزدیک اس عمومی رویے کی تشکیل کر رہے ہیں لاشعوری طور پر جس کا ہمیں ادراک نہیں ہے۔ آج ہم جب ایک معاشرے کے طور پر دیکھ رہے ہیں اور اس بات کا ادراک کر لیا ہے کہ ہمارا معاشرہ ایک عدم رواداری پر مبنی معاشرہ بنتا چلا جا رہا ہے، ایک عدم برداشت کی فضا پیدا ہوتی چلی جا رہی ہے اور ہمیں دوبارہ اس سے جو امت وسط کا تصور ہے، اس کا احیا کرنا ہے تو میرے نزدیک ان عوامل پر غور کیے بغیر ان میں اصلاح کیے بغیر ہم کوئی امت وسط کا منصب ایک معتدل مزاج معاشرے کی تشکیل میں آگے نہیں بڑھ سکتے۔

تیسری نشست

ہماری وسعتِ نظری

محمد عامر رانا

اس نشست میں ہماری کوشش ہے کہ ان مسائل کو دیکھا جائے کہ رائے سازی کیا ہوتی ہے، کون سے ادارے اس میں کام کرتے ہیں اور کس طرح ہمارے نقطۂ نظر کو محدود یا وسیع کرتے ہیں۔ ان میں ہمارا مرکزی دھارے کا میڈیا ہے جس میں پرنٹ بھی ہے الیکٹرانک بھی۔ اس کے ساتھ سوشل میڈیا ہے۔ ہمارے پاس ایک اور دائرہ ہے جو ہمارے ذہنی رجحانات پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتا ہے اور اس کا پرتو ہماری پالیسی سازی پر بھی ہے۔ حتیٰ کہ ہمارے بین الاقوامی تشخص پر بھی اس کے اثرات ہیں۔ ہمارے تمام شرکاء یونیورسٹیوں کا پس منظر رکھتے ہیں اور لکھنے پڑھنے سے ان کا گہرا تعلق ہے۔ اگر میں آپ سے پوچھوں کہ کتنے لوگ ہیں ہمارے درمیان جو صاحبِ کتاب ہیں؟ جو صاحبِ کتاب ہیں کیا ان کو لگتا ہے کہ ان کا یہ کام کہیں نہ کہیں جا کر اثر انداز ہوتا ہے اور تبدیلی کا باعث بنتا ہے۔ اگر ہے تو ہماری یہ کاوشیں سماج کی بہتری میں کتنی کارگر ثابت ہو رہی ہیں۔

''اچھے ملک'' کے انڈیکس (Good Country Index) کو دیکھیے۔ اس انڈیکس کی رُو سے 'اچھا ملک' وہ سمجھا جاتا ہے جو نہ صرف، بغیر کسی نقصان کے یا بغیر کسی ایسی صورتحال کے جس سے کوئی تصادم کا خطرہ ہو، اپنے اور اپنے عوام کے مفادات کا تحفظ کرتا ہو بلکہ اس کے ساتھ ساتھ باقی دنیا کے امن و ترقی میں بھی اس کا حصہ شامل ہو۔ اس کے اندر کافی چیزیں ہیں۔ اس میں سب سے اہم یہ ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے ضمن میں آپ کا حصہ کیا ہے؟ ثقافتی حوالے سے جو تبدیلیاں آرہی ہیں جو پوری دنیا کے لیے ایک چیلنج ہے، اس میں آپ کا حصہ کیا ہے؟ امن و امان کے حوالے سے، ورلڈ آرڈر کے حوالے سے آپ کی شراکت کیا ہے؟ ماحول اور کرۂ ارض کو آلودگی سے بچانے میں آپ کا حصہ کیا ہے؟ خوشحالی، عوامی معیارِ زندگی، صحت و روزمرہ زندگی کی

سہولیات کی فراہمی میں آپ کا حصہ کیا ہے؟ اس انڈیکس میں پاکستان کا نمبر ایک سو گیارہواں ہے۔ گذشتہ کئی سالوں سے مسلسل پاکستان کا نمبر 111 ویں پوزیشن کے اندر ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی میں ہماری پوزیشن 102 نمبر پر ہے۔ اسلامی ممالک میں دیکھیں تو شائد مصر کے علاوہ کوئی ایسا اسلامی ملک نہیں جس کا اسکور یہاں پر سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کی ترقی کے ضمن میں اچھا ہو۔

کیا آپ کے علم میں ہے کہ یہودیوں کی آبادی اس وقت دنیا میں کتنی ہے؟ 10.2%۔ لیکن آبادی کے تناسب سے کہیں زیادہ نوبل پرائز یہودیوں کے پاس ہیں۔ اوران میں زیادہ نوبل پرائز طب کے میدان میں ہیں۔ اِن کے 35% سائنس میں ہیں اور صرف 5% کے قریب ادب میں ہیں اور چند ایک ان کے امن کے نوبل ایوارڈز ہیں۔ اس کے مقابلے میں آپ کے علم میں ہے کہ مسلم امہ کی عددی قوت کتنی ہے اور کتنے ملک ہیں؟ ایک بلین سے زیادہ یعنی تقریباً آدھی دنیا۔ مسلمانوں کے صرف بارہ انعامات ہیں۔ اور ان میں سے جو امن کے انعامات ہیں، ہم جانتے ہیں کہ ان کا ایک خاص سیاسی پس منظر ہوتا ہے۔ سائنس کے نوبل پرائز دو ہیں، اور اگر ایک اس میں سے مذہبی بنیادوں پر نکال دیا جائے تو اس میں سے صرف ایک بچتا ہے اور ادب میں صرف دو ایوارڈ ہیں پوری مسلم امہ میں۔

اس تفصیل سے آپ سمجھ شاید رہے ہوں گے اور یہ ایک خیال بھی ہے کہ شائد نوبل پرائز کا ایک خاص پس منظر ہے اور یہ ایک غیر شفاف انعام ہے کیونکہ علامہ اقبال کو اور دیگر اسلامی سکالرز کو نہیں ملا۔ تو یہ دیکھ لیتے ہیں کہ اسلامی دنیا کا سب سے بڑا ایوارڈ کونسا ہے۔ یہ ایوارڈ ''کنگ فیصل ایوارڈ'' ہے جو پانچ شعبوں میں دیا جاتا ہے: اسلام کے لیے خدمات، علومِ اسلامیہ میں خدمات، ادب میں خدمات، سائنس میں خدمات اور طب میں خدمات۔

اگر آپ ان کی ویب سائٹ ملاحظہ کریں تو کئی یورپین ملیں گے جن کو علومِ اسلامیہ کے شعبے میں یہ ایوارڈ ملا۔ لیکن جب آپ سائنس اور طب کے شعبے میں دیے گئے انعامات کی فہرست

دیکھیں تو اس میں ایک بھی مسلمان نہیں ہے۔ سو جو اسلامی دنیا کا سب سے بڑا اور سب سے اہم ایوارڈ ہے اس میں بھی مسلمانوں کا حصہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ جو ایوارڈ ہیں وہ زیادہ تر ادب کے ہیں اور ایوارڈ یافتہ شخصیات کا تعلق مصر، مراکش اور دیگر شمالی افریقہ کے ممالک سے ہے۔

پاکستان میں یہ ایوارڈ مولانا مودودی صاحب کو اور پروفیسر خورشید احمد صاحب کو ملا، اس کے علاوہ تیسرا کوئی بھی نہیں۔ پاکستان جو دنیا میں دوسرا بڑا اسلامی ملک ہے تو مسلم دنیا کے اس ایوارڈ میں اس کا حصہ کتنا ہے؟ کلچر کے حوالے سے بات ہوئی تھی کہ جس معاشرے میں منطقی اور حقیقت پسندانہ زاویہ ہائے نظر نہ ہوں وہاں کلچر کمزورہ ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے اور جو عالمی انڈیکس سے بھی ظاہر ہے کہ کلچر دراصل کسی معاشرے کا تخلیقی اظہار ہوتا ہے۔ یہ اظہار جتنا مضبوط ہوگا اتنی ہی آپ کی سائنسی ترقی بھی نمایاں ہوگی۔ ایسا نہیں ہوتا کہ کسی جگہ ایک مظہر بہت کمزور ہو اور دوسرا طاقتور ہو جائے۔

ماحول کی بہتری میں کردار کے حوالے سے ہمارا درجہ چھبیسواں ہے۔ اگر ہم اپنی اس علمی، فکری اور ثقافتی پس ماندگی کی کوئی ایک وجہ تلاش کرنا چاہیں تو بہت سے جواب ہو سکتے ہیں، جیسے تعلیم کی کمی، سیاسی عدم استحکام، رویوں کی بے یقینی وغیرہ۔ یہ تمام چیزیں اپنی جگہ ہیں اور کہیں نہ کہیں اثر انداز بھی یقیناً ہوتی ہیں۔ ایک چیز اس میں یہ ہے بھی ہے کہ آپ کا اپنا نقطہ نظر اپنے بارے میں کیا ہے۔ آپ خود کو، اپنے معاشرے کو، اپنے ملک کو کیا سمجھتے ہیں۔ یہ سب چیزیں آپ کی ذہن سازی میں کردار ادا کرتی ہیں۔

اور ایک جو 'گوگل انسٹرکشنز' کی بنیاد پر ہر سال انڈیکس مرتب ہوتا ہے کہ کون سی قوم ہے جو سب سے زیادہ آگے کا سوچنے والی ہے تو اس میں پچھلے برس جرمنی سب سے اوپر آیا جبکہ پاکستان سب سے آخر میں تھا۔ اس میں یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ کسی ملک میں کتابیں کتنی چھپتی ہیں۔ ہماری کتابوں کی تعداد 3811 تھی اور اس کے مقابلے میں ہماری آبادی دیکھیں۔ اس کو بھی تقسیم کیا جائے تو مذہب، ادب اور سائنس کی کتابیں کتنی ہوں گی۔ 2012ء میں پاکستان میں سائنسی

موضوعات پر جو عالمی انڈیکس میں 15 کتابیں رجسٹر ہوئیں، پتا نہیں وہ چھپ بھی سکیں یا نہیں۔ تو اگر مستقبل کے بارے میں ہمارا جذبہ ایسا ہے تو اس کی روشنی میں اگر پوچھا جائے کہ پانچ سال بعد یا دس سال بعد آپ خود کو اور پاکستان کو کہاں کھڑا دیکھتے ہیں تو جواب کیا ہو سکتا ہے۔

نائن الیون سے پہلے جو خبر سب سے زیادہ اخبارات میں زیر بحث ہوتی تھی، کیونکہ اس وقت اخبارات الیکٹرانک میڈیا سے زیادہ تھے، یہ تھی کہ کیا پاکستان ایک ناکام ملک ہے؟ 2015ء میں پاکستان تباہ ہو جائے اور 2025ء میں تقسیم ہو جائے گا۔ یہ سب اندیشے اب غلط ثابت ہو چکے ہیں تو اس کی وجہ آپ کے خیال میں کیا ہے؟ ہم دیکھ رہے ہوتے ہیں کہ تھنک ٹینک ہوتا ہے جو سوچنے والے لوگ ہیں کنٹری بیوٹ کر رہے ہوتے ہیں کہ آگے کیا ہوگا۔ اب احسن اقبال ایک بڑی اہم بات کرتے ہیں کہ 2025ء میں پاکستان کی اکانومی کا نمبر کیا ہوگا۔ اندازہ ہے کہ پاکستانی اکانومی 6.7 کی شرح افزائش سے اٹھارویں نمبر پر پہنچے گی۔ اس اندازے اور پیش گوئی کی وجہ کیا ہے؟ 'سی پیک' اور یہ صرف سی پیک کی وجہ سے ہی نہیں اس کا پورا ایک فارمولا ہے۔ کیمبرج کے دو پروفیسروں نے سی پیک کا باقاعدہ معاہدہ ہونے سے پہلے یہ پیش گوئی کی تھی۔ علم کی دنیا کے فروغ میں اگر کوئی ہمارا حصہ ہو تو یہ بہت اہم ہے، یہ ہماری تخلیقی صلاحیت کو بڑھاتا ہے۔ ہمارے امیج کو اور درجہ بندی کے جو چار عوامل اوپر بیان ہوئے ہیں، ان کے حوالے سے بہتر کرتا ہے۔ یہ ورکشاپ جو ہم نے سماجی ہم آہنگی کے حوالے سے رکھی ہے تو آج کی دنیا میں یہ ایک اہم عامل بن گیا ہے جس سے آپ کے ملک کے استحکام کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی سے مستقبل کے اندازے لگائے جاتے ہیں۔ آپ کی کامیابی اور آپ کی نیک نامی میں اس کا بنیادی حصہ ہے۔ اسی وجہ سے ڈاکٹر صاحب قبلہ فرماتے ہیں کہ ایک ''انٹرنیشنل گلوبل سٹیزن شپ'' کا تصور بڑی تیزی سے فروغ پا رہا ہے۔ اب معاشروں کی صورت حال بڑی تیزی سے بدل رہی ہے۔

آپ کے علم میں ہے کہ ابھی راشد المکتوم نے دبئی میں ایک مندر کا افتتاح کیا ہے اور انہوں نے تین مزید مندروں کے لیے جگہ دے دی ہے اور ایک گردوارے کے لیے جگہ دی۔ یہ ایک

علامت ہے کہ معاشروں کی حیثیت بدل رہی ہے۔ اب یہ اکثریت اور اقلیت کا مسئلہ نہیں ہے۔ ایک ہمارا 2025ء کا ویژن ہے اور ایک سعودی عرب نے 2030ء ویژن بنایا ہے۔ کیا ہمارے ذہن میں سعودی عرب کا ایک اسلامی ریاست سے زیادہ کا کوئی تصور آتا ہے؟ اگر اس ویژن کی تفصیلات کے اوپر سے سعودی عرب کا نام ہٹا دیا جائے تو یہ ہمیں لگے گا کہ اچھا یہ تو بنگلہ دیش کا کوئی ویژن ماڈل ہے، یا ملائیشیا یا ترکی کا۔

یورپ اور مغرب کے معاشروں کی ماہیت بھی بدل رہی ہے، وہ اپنے تنازعات حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بڑے معاشروں میں افراد کا باہمی ربط وضبط بڑھ رہا ہے۔ خاص طور پر جب ہمارے پاس ایک تقریر آئی ہے کہ مغرب میں مسلمانوں کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ہم ان کی جائزہ کاری کر رہے ہیں کہ وہاں پہ یگانگت کا عمل کمزور ہے۔ کیا وہ اصول ہم پر لاگو نہیں ہوگا۔ تو وہاں پہ جب ہم یہ صورتحال دیکھتے ہیں تو ہم ایک درد محسوس کرتے ہوں خواہ وہ کسی بھی نسبت سے ہو۔ یہ سماجی یگانگت معیشت، سیاست اور ہر شعبہ زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس حوالے سے آپ دنیا میں سترویں نمبر پر ہیں۔ اس صورت حال کو دیکھنا اور بھی اہم ہو جاتا ہے جب خاص طور پر ہماری حکومت اور ہمارا معاشرہ کئی طرح کے دعوے کرتے ہیں کہ ہم بہت آگے جا رہے ہیں اور ہمارے پاس عزت وافتخار کی بہت سی چیزیں ہیں تو ادھر بھی دھیان دینا چاہیے۔

مثبت رویہ ہی تو سب سے اہم چیز ہے جو مغرب کو مغرب بناتی ہے اور جو قومیں پیچھے رہ گئی ہیں، ان کی پس ماندگی کی وجہ ہے۔ یہ دیکھیے کہ یہ مؤقف بنتا کیسے ہے؟ یہ پانچ چیزیں جنہیں ہم حواس خمسہ کہتے ہیں انہی کی بنیاد پر ہم رائے بناتے ہیں۔ علم کے لیے آپ کی تلاش آپ کو اور آپ کے معاشرے کو آگے لے جاتی ہے اور اس سے دوری آپ کی پس ماندگی کا باعث ہوتی ہے۔ نصاب صرف معلومات کا ایک ذخیرہ ہے۔ اپنے نظامِ تعلیم کا ہمیں پتا ہے کہ اس کا مقصد ایک طرح کی 'پراڈکٹ' تیار کرنا ہے۔ یعنی ریاست کو اس طرح کی پراڈکٹ چاہیے، کسی ایک سماجی طبقے کو ایک اور قسم کی پراڈکٹ چاہیے، کسی دوسرے طبقے کو ایک اور طرح کی۔ کیا انسان محض ایک ایسی

پراڈکٹ ہیں جن کو ریاست اور طاقتور طبقے اپنے استعمال کے لیے جیسا چاہے بنالیں۔اب میرا خیال ہے کہ اس سوال پر بھی ہمیں غور کرنے کی ضرورت ہے۔اور کیا علم کی قوت کا ہمیں پتا ہے؟ کیونکہ نالج کی قوت ہی دنیا میں ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کا ذریعہ ہے۔

معاشرے میں عدم برداشت اور میڈیا کا کردار

مبشر زیدی

اکثر ہم فورمز پر بات کرتے ہیں میرا خیال ہے اس کا عنوان ہونا چاہے تھا کہ معاشرے میں عدم برداشت اور بدکردار میڈیا، کیونکہ میڈیا نے گزشتہ چند سالوں میں ہمارے درمیان مذہبی، نسلی اور ہر قسم کی منافرت اجاگر کرنے میں بہت بڑا کردار ادا کیا ہے۔ہم کہیں بھی جاتے ہیں تو سب سے پہلے تسلیم کرتے ہیں کہ ہاں ہم بھی اتنے ہی اس خرابی کے ذمہ دار ہیں جتنا کوئی اور۔آپ اساتذہ ماشاءاللہ قوم کے معمار ہیں اور آپ لوگوں نے ہی نسلوں کو آگے لے کر جانا ہے۔میں بھی جب پڑھا ہوں، حالانکہ اسلام آباد میں ایک گورنمنٹ سکول پڑھا ہوں، تو مجھے لگتا ہے ہماری تعلیم ہمیں الجھاؤ میں مبتلا کر دیتی ہے۔یہ سوال اٹھانے کی حوصلہ افزائی نہیں کرتی۔سوال ایسے رویوں پر یا ان چیزوں پر جو مقرر اور طے شدہ سمجھے جاتے ہیں۔اسلام میں بھی سوال اٹھانے کا کہا گیا ہے۔تو سب سے پہلے تو سوال کرنے کا جو ذمہ میڈیا کے حوالے تھا اس میں سے ہم تھوڑے ناکام ہوئے ہیں کیونکہ جب ریاست نے قوم میں ایک بیانیہ استوار کرنا ہوتا ہے تو وہ میڈیا کو استعمال کرتے ہیں اور بدقسمتی سے ہم لوگ استعمال ہوتے ہیں جس کی وجہ مالی مفادات، دباؤ یا کچھ بھی ہوسکتی ہے۔مثلاً تازہ مثال مشعال خان کے قتل کی ہے۔اس واقعے پر خبریں سب کے پاس گئیں لیکن جو صفِ اوّل کے چینل ہیں انھوں نے یہ خبر چلائی کہ دو طلبہ گروہوں کے درمیان تصادم اور ایک طالب علم جاں بحق۔جب یہ خبر آئی تو مجھے بھی لگا کہ شاید طلبہ تنظیموں کے درمیان کوئی معمول کا جھگڑا ہوا ہے لیکن جب بعد میں ہم نے تحقیقات کیں تو ساری کہانی سامنے آئی۔اس سے پہلے بلاگرز کا

ایک معاملہ ہوا۔آپ سب جانتے ہیں کہ کچھ بلاگرز کو اٹھایا گیا اور غیر قانونی طور پر ان کو رکھا گیا۔پھر ان پر الزامات لگے کہ انھوں نے توہینِ مذہب کی ہے۔ہمارا مؤقف قانونی ہونا چاہیے، ہم یہ نہیں کہہ رہے کہ انہوں نے کی ہے کہ نہیں کی، ہم صرف یہ کہہ رہے ہیں جب ایک قانونی راستہ موجود ہے تو معاملے کو اسی سے حل کریں۔اگر انہوں نے توہینِ مذہب کی ہے تو بالکل انہیں سزا ملنی چاہیے لیکن یہ تو کوئی طریقہ نہیں کہ کسی کو غائب کر دیا جائے۔کہنے کا مطلب ہے کہ میڈیا نے، ہم لوگوں نے حالات کا صحیح چہرہ نہیں دکھایا۔غازی صاحب جیسے لوگ سارے میڈیا میں بہت غیر معمولی کام کر رہے ہیں۔ہم لوگ تو ابھی بات کر رہے ہیں، انہوں نے تو اس وقت بات کی جب پابندیاں تھیں۔جب شاید اتنی آزادی نہیں تھی۔غازی صاحب یا ان جیسے دوسرے لوگوں کو دیکھ کے ہمیں بھی محسوس ہوا کہ کم از کم آئینی طریقے سے بات ضرور کرنی چاہیے اور یہ کہ جب تک بات نہیں کی جائے گی تب تک عدم برداشت تو رہے گی۔ہمارا معاشرہ تو بات سننے کو تیار ہی نہیں، چاہے اقلیتوں کا مسئلہ ہو، فرقہ واریت کا مسئلہ ہو، ہم نے ہر مسئلے پر انتہا پسندانہ رائے دینے کی کوشش کی ہے، یہ خیال کیے بغیر کہ ہم انسان بھی ہیں اور پاکستانی بھی۔چاہے ہمارے ہندو بھائی ہوں، چاہے عیسائی ہوں، ہم نے کبھی کوشش نہیں کہ کسی طرح ہم لوگوں کو سچ دکھائیں اور اس کی وجوہات میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں کہ صحافتی اداروں نے پیسوں کے عوض، دباؤ کے عوض اور بہت سی دوسری چیزوں کے عوض اپنے آپ سے سمجھوتا کیا۔

تو اب ہم پہ ذمہ داری بھی زیادہ ہے کہ جو کچھ بھی ماضی میں ہو چکا اس کو ایک طرف رکھ کر دوبارہ سے کوشش کریں کہ کم از کم ہم لوگوں کو صحیح تصویر دکھائیں۔ہم نے اب بھی یہ ساری بات کی بلاگرز کی، مشعال خان کی، یقین مانیں ہماری تصویریں ہی لگا دی گئیں پاکستان ڈیفنس آفیشل پیج پر کہ یہ توہین مذہب کرنے والوں کی حمایت کر رہے ہیں حالانکہ ہم صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ اگر ان کے اوپر کیس ہے تو بالکل آپ کے پاس قانون ہے۔آپ اس کے تحت ان کو عدالت میں کیس چلائیں اور اگر وہ قصوروار ہیں تو ان کو سزائیں دیں لیکن یہ کیا طریقہ ہے کہ اکیلے ان کو اٹھا کر گمشدہ

کر دیا اور اس کے بعد چار مہینوں کے بعد آزاد بھی ہو گئے ۔ اسلام آباد ہائیکورٹ کے جن جج صاحب نے پھر یہ کیس اٹھایا، میں ان کو جانتا ہوں۔ شوکت صدیقی صاحب کے ساتھ وکلاء تحریک میں ہم لوگوں نے ایک پروگرام کیا کہ انہوں نے صرف یہ کیس اس لیے اٹھایا کہ وہ جوڈیشل کونسل میں ایک کرپشن کیس کا سامنا کر رہے ہیں جس میں شاید ان کو سزا ہو جائے تو اس سے بچنے کے لیے انہوں نے یہ کیس اٹھایا تھا کہ سپریم کورٹ اور جوڈیشل کمیشن ان کو سزا نہ دے سکے۔ اس بات پر پیمرا نے ہم پر تین دن کے لیے پابندی لگا دی۔ میں ان جج صاحب کے پاس اسلام آباد گیا، میں نے کہا کہ میں جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ توہینِ مذہب ہوئی ہے؟ تو انہوں نے کہا میں تمہیں دکھاتا ہوں۔ انہوں نے تین چار فیس بک کے پیج دکھائے جو واقعی توہینِ مذہب کے مرتکب تھے لیکن یہ گمنام پیج تھے، میں نے کہا سر یہ کیسے ثبوت ہے کہ انہوں نے یہ اسٹیٹس کیا ہوگا؟ تو کہنے لگے نہیں مجھے پتا ہے۔ میں نے کہا سر اگر چار مہینے تک آئی ایس آئی نے یا ایجنسیز نے دیکھا، ان کو تو نہیں پتا چلا کہ وہ اس بارے میں حتمی فیصلہ کر سکیں کہ ہاں واقعی انہوں نے توہینِ مذہب کی ہے۔ تو انہوں نے کہا نہیں نہیں اس پر تو کوئی سمجھوتا نہیں ہو سکتا۔ میں نے کہا سر آپ ایک جج ہیں، آپ کا کام انصاف دینا ہے، کل کو خدانہ کرے کوئی مجھ پر الزام لگا دے اور میں آپ کی عدالت میں آ جاؤں تو جتنا سخت آپ کا مؤقف ہے، آپ منصف تو نہیں بنیں گے۔ آپ تو سیدھا سیدھا مجھے لٹکا دیں گے کہ آپ پر توالزام ہے۔ پھر خیر بعد میں ان کو سمجھ آئی، میں نے انہیں سمجھایا کہ سر آپ منصف ہیں، ہمارا ایک آئین ہے اس کے تحت کوئی توہین مذہب کرے تو اسے سزا ملنی چاہیے۔ آپ سزا دیں لیکن ثبوت تو لے کر آئیں۔ ماضی میں بھی یہی ہوا۔

اب آپ لوگ دیکھیں کہ غیر ملکی ایجنٹ ہونے کا الزام لگا دیا جاتا ہے۔ غیر ملکی ایجنٹ، را کا ایجنٹ ہونے کا الزام بے دریغ لگا دیا جاتا ہے کیونکہ قوم نے اس چیز کو مذاق سمجھ رکھا ہے۔ ان کو پتہ چل چکا ہے کہ اگر آپ کسی پر غیر ملکی یا را کا ایجنٹ ہونے کا الزام لگا دیں تو انہوں نے کہا یہ تو لگاتے ہی رہے ہیں۔ تو اب یہ ایک نئی لہر آئی ہے کہ آپ کے مؤقف کے برخلاف کوئی بات کرے تو اس

پر توہینِ رسالت کا الزام لگا دو۔ یہ اتنا سنگین الزام ہے جو لگائے گا اس کو بھی پتا ہے کہ اگر یہ الزام سچا نہیں ہے تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے۔ تو یہ ساری چیزیں ہمارے آئین میں ہیں۔ میرے خیال میں، میں بھی انہی چیزوں سے لڑ رہا ہوں جس طرح آپ لڑ رہے ہیں۔ آپ نے اس معاشرے کے بچوں کو مثبت سوچ دینی ہے، میں گورنمنٹ اسکول میں پڑھا، جب میں چھٹی جماعت میں تھا، یہ بات ہے 83-1982ء کی، میں اس وقت گیارہ سال کا تھا تو مطالعہ پاکستان کے ٹیچر پہلے دن آئے اور انھوں نے آ کر ہمیں فیض صاحب کے دو شعر سنائے اور ہمیں نہیں سمجھ میں آیا۔ گیارہ سال کی عمر تھی اور سوچتے رہے کہ انہوں نے کیوں سنائے؟ اس کا مطالعہ پاکستان سے کیا تعلق ہے؟ لیکن انہوں نے ہم پر سوچ کا دروازہ کھولا۔ کم از کم ہم نے یہ ضرور سوچا کہ یہ فیض صاحب کون ہیں؟ تھوڑا بہت ہم نے اردو ادب پڑھنا شروع کر دیا تھا لیکن پھر ہمیں معلوم ہوا کہ یہ انہوں نے کیوں پڑھا۔ تو وہ سوچ کا دروازہ بچوں کے لیے آپ لوگوں نے کھولنا ہے۔ جتنا سوچیں گے اتنا ہی ان کا ذہن وسیع ہوگا۔ یہ بات محض نصاب کے حوالے سے نہیں، نصاب تو صرف تذبذب اور بے یقینی پیدا کرے گا۔ اگر آپ اس کو بالکل لگے بندھے طریقے سے چلائیں گے تو ساری زندگی پراگندگی کا شکار ہی رہیں گے۔ پھر یہ ہے کہ مجھے بہت احساس ہوا کہ میں مختلف ہوں۔ جب نویں جماعت میں میرے اسلامیات کے ٹیچر آئے تو انہوں نے پوچھا کہ آپ شیعہ اسلامیات پڑھیں گے کہ سنی اسلامیات۔ میں نے کہا کہ مجھے تو نہیں پتا تھا کہ یہ الگ الگ ہوتی ہیں۔ اور پھر میں نے کہا میں تو وہی پڑھوں گا جو میرے دیگر ہم جماعت پڑھ رہے ہیں۔ اس میں کیا ہے اگر اسلام کا ہے تو کیا فرق ہے لیکن انہوں نے میرے ذہن میں یہ چیز ڈال دی کہ میں مختلف ہوں۔ آپ لوگ بات کو کچے ذہنوں سے پکے ذہنوں تک لے کر جاتے ہیں تو آپ کا کردار بہت زیادہ ہے۔

یہ بات ٹھیک ہے کہ ساری ذمہ داری استاد کی نہیں ہے، لیکن اگر استاد بھی یہ سمجھے کہ چونکہ بچہ اٹھارہ گھنٹے گھر پر گزارتا ہے تو گھر والوں کی زیادہ ذمہ داری ہے تو بچے کی تربیت نہیں ہو سکے گی۔

ہم سب کی زندگیوں میں ہمارے اساتذہ کا بڑا اثر ہے۔ شاگرد کی شخصیت اپنے استاد کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ سوشل میڈیا پر میرے بچے مجھ سے زیادہ تیز ہیں۔ گو کہ وہ ہم سے آگے نکل جاتے ہیں لیکن ہمیں بھی ٹیکنالوجی کو سمجھنا ہوگا تاکہ اپنے بچوں کی حفاظت کر سکیں۔

سوشل میڈیا اور سماجی ہم آہنگی

سبوخ سید

(سبوخ سید کی گفتگو کے اہم نکات گذشتہ ورکشاپ کی روداد میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں)

ڈاکٹر قبلہ ایاز: الحمدللہ بھرپور نشست رہی۔ کم از کم اس نشست کے بعد ہمارے اساتذہ کرام اپنے طور پر ہم یہ تو کر سکتے ہیں کہ ہمارے جو اپنے فیس بک اکاؤنٹ ہیں یا ہمارے اپنے بلاگز ہیں ان کو ہم اپنی قوم کی بہتری کے لیے استعمال کریں۔

سماجی ہم آہنگی اور مذہبی رواداری میں اساتذہ کا کردار

آٹھویں ایک روزہ تربیتی ورکشاپ

9 اگست 2017ء، اسلام آباد

پہلی نشست

میزبان: محمد عامر رانا

ڈائریکٹر، پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز

معلم: ○ پاکستان کا فکری چیلنج

ڈاکٹر قبلہ ایاز

سابق وائس چانسلر، پشاور یونیورسٹی

دوسری نشست

میزبان: محمد عامر رانا

ڈائریکٹر، پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز

معلم: ○ نصاب یا طرزِ تدریس

عمار خان ناصر

مذہبی سکالر، الشریعہ اکیڈمی، گوجرانوالہ

○ تبدیلی میں اساتذہ کا کردار

ڈاکٹر حسن الامین

ایگزیکٹو ڈائریکٹر، اقبال انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ فار ریسرچ اینڈ ڈائیلاگ، اسلام آباد

تیسری نشست

میزبان: محمد عامر رانا

ڈائریکٹر، پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز

معلم: ○ عمومی رویّوں میں عدم برداشت

خورشید ندیم

کالم نگار، اینکر پرسن

پہلی نشست

پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز کے زیر اہتمام اساتذہ کرام کے لیے تربیتی ورکشاپس کے سلسلہ میں 9 اگست 2017ء کو کالجوں کے اساتذہ کے ساتھ ایک علمی مکالمہ منعقد ہوا جس کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا، جس کے بعد پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز کے ڈائریکٹر اور ورکشاپ کے میزبان محمد عامر رانا نے افتتاحی کلمات پیش کیے۔

محمد عامر رانا

سب سے پہلے تو ہم اس مذاکراتی نشست میں آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ مکالمہ شروع کرنے سے پہلے آپ کے سامنے ادارے کا تعارف اور مکالمے کے آداب دہرائے دیتے ہیں۔ آپ سب پڑھے لکھے ہیں اور جانتے ہیں کہ جب کوئی بات کر رہا ہو تو اسے ٹوکنا انتہائی معیوب عمل ہے اس لیے کسی کو ٹوکیں نہیں اور جب آپ کی گفتگو کی باری آئے تو اطمینان اور تحمل کے ساتھ اپنی بات پوری کریں۔ کوئی بھی بات ایسی نہیں ہے جو تحمل سے نہ کی جا سکے۔ بات کرتے ہوئے یہ ذہن میں رکھیں کہ آپ کی بات یہاں صرف اس ہال تک محدود نہیں رہے گی بلکہ اسے ریکارڈ بھی کیا جائے گا۔ اس لیے پہلے ہی سوچ سمجھ کر ایسی آراء کا اظہار کریں جن پر آپ کو نظر ثانی کی ضرورت نہ پڑے۔ جب آپ سوال کرنا چاہیں یا کوئی تجویز دینا چاہیں تو اپنا نام بتا کر بات کا آغاز کریں۔ امید ہے کہ آج کا مکالمہ بھرپور رہے گا، آپ کے علم میں ہوگا کہ آج کے موضوع کی جہت کیا ہے، اب ڈاکٹر صاحب مکالمہ کا آغاز کریں گے۔

پاکستان کا فکری چیلنج

ڈاکٹر قبلہ ایاز

بسم اللہ الرحمن الرحیم

والعصر ان الانسان لفی خسر الا الذین آمنوا وعملوا الصلحت وتواصوا بالحق و تواصوا بالصبر۔ بہت خوشگوار صبح ہے کہ پاکستان بھر سے اساتذہ موجود ہیں، PIPS ایسی تنظیم ہے جس نے گیارہ سال میں بہت اہم اور ابھرتے ہوئے مسائل پر کام کیا ہے، وہ کام جو ہمارے تعلیمی اداروں میں ہونا چاہیے لیکن وہاں اور کام بہت ہوتے ہیں اور یہ خلا PIPS پُر کر رہا ہے، اس پر عامر رانا صاحب شکریہ کے مستحق ہیں۔

میری بھی ان موضوعات میں سامع یا متکلم کی حیثیت سے شرکت رہی ہے، آج کا موضوع فکری چیلنج ہے، اور یہ موضوع از خود ایک چیلنج ہے۔ ہماری نسل جو تعلیم سے منسلک ہے، ایک خاص نصاب کی پیداوار ہے، وہ نصاب بنیادی طور پر جنرل ضیا کا تشکیل کردہ تھا۔ یہ نصاب صرف ہمارے لیے فکری چیلنج نہیں بلکہ پورے خطہ کے لیے ہے، کیونکہ ایک نصاب بین الاقوامی بھی بنا جو افغان مہاجرین کے لیے تھا، وہ پاکستان میں نہیں بلکہ امریکہ کی نبراسکا یونیورسٹی میں بنا تھا جس کے نتیجہ میں وہ افغان بچے آج افغانستان میں موجود ہیں۔ بظاہر حکومت اشرف غنی کی ہے لیکن حقیقت میں اور تنظیموں کا کنٹرول ہے، یہ نصاب اس وقت بھی افغانستان کے بہت بڑے خطہ میں رائج ہے، چنانچہ اس نصاب نے موضوع کو اور بھی مشکل بنا دیا ہے جس کا اندازہ سوال جواب کی نشست میں ہو جائے گا۔

پاکستان کس مقصد کے لیے بنایا گیا تھا؟ اس چیلنج کا تعلق پاکستان بننے سے پہلے سے ہے، مسلم لیگ کی قیادت میں بڑے بڑے لیڈر تھے، قائداعظم نے آیا پاکستان اس مقصد کے لیے بنا تھا کہ اس میں اسلامی نظام قائم ہو؟ اگر ایسا تھا تو کیا مسلم لیگ کے اندر جو مجلس دانش تھی کیا اس کے سامنے اسلامی نظام کا خاکہ واضح تھا؟ کہ حکومت کا بنکاری کا اور قانونی و تعلیمی نظام کیا ہو؟

معاشرتی نظام کیسا ہو؟ ہمارا زور ریاست پر ہوتا ہے معاشرے پر نہیں۔

دوسرا فکری چیلنج کہ کیا مسلم لیگ کے اندر یہ بات واضح تھی کہ خاکہ مختلف اداروں کے درمیان کیا ہوگا؟ اور جب مقبول نعرہ لگایا جائے کہ پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ، تو آیا یہ نعرہ مسلم لیگ کی پالیسی تھی؟ یا اس ہجوم کے اندر سے یہ نعرہ لگایا گیا جسے کوئی ختم نہ کر سکا؟

مثلاً پاکستان قومی اتحاد بنا بھٹو کے خلاف، لیکن اسے کہیں بھی نظامِ مصطفیٰ نہیں کہا گیا، خان ولی خان بھی تھے لیکن ہجوم کی طرف سے نظامِ مصطفیٰ کا نعرہ آ گیا تو کوئی اس کو ختم کرنے کی جرأت نہیں کر سکا کہ ہمارا اتحاد صرف بھٹو کو ہٹانے تک ہے۔ تو کیا یہ نعرہ بھی جذباتی ہجوم کی طرف سے آیا؟ جو گلے کا ہار بن گیا؟ اس پر ہم نے سوچنا ہے۔

چوتھی بات کہ اگر واقعی یہ چیلنج ہے، مسلم لیگ کو ہم ایک منٹ کے لیے مان لیں کہ اسلامی نظام ان کے منشور کا حصہ تھا تو آیا اس جماعت کی ہیئت اور لوگ کیا اس نظام کو روبہ عمل لانے کے لیے مناسب تھے؟ کیا وہ اپنے طور پر اس نظام کے ماہر تھے؟ مثلاً کوئی سوشلسٹ نظام لانا چاہتا ہے تو اسے پہلے اس نظام کی مہارت ہو۔

اگر خالصتاً مذہبی حوالے سے دیکھا جائے تو کوئی شک نہیں کہ علما کی ایک تعداد مسلم لیگ کی حامی تھی جیسے مولانا شبیر احمد عثمانی و مولانا اشرف علی تھانوی لیکن ایک بہت بڑی تعداد مخالف بھی تھی، مخالفت کرنے والوں میں ایسے ایسے نام تھے جن کی رائے سے تو اختلاف ممکن ہے لیکن ان کی مذہبی حیثیت سے انکار ممکن نہیں، جیسے مولانا حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا ابوالکلام آزاد تو کانگرس کا حصہ تھے اور وزیر تعلیم بھی بنے، ان کی رائے فیصلہ کن ہوتی تھی، انہوں نے ہمیشہ دینی اقدار کے لیے بڑا کام کیا۔ اگر یہ مذہبی مطالبہ تھا تو مذہبی رہنماؤں کی بڑی تعداد اس کی حامی کیوں نہیں تھی؟

لیکن جو نقشہ ہمارے سامنے آیا وہ یہ تھا کہ مسلمانوں کی اکثریت نے مولانا مدنی کی رائے سے اتفاق نہیں کیا اور پاکستان کے حق میں رائے دی، اور ایک بہت بڑی جذباتی کیفیت تھی کہ

ایک عجیب ملک ہوگا، اسلامی اقدار اور نظام نافذ ہوگا لوگ بہت خوش تھے، یہ سوال مسلسل ہمارا پیچھا کر رہا ہے، ہمارے سامنے یہ سوال اب بھی ہے کہ پاکستان کس مقصد کے لیے بنایا گیا تھا؟ دین کے ساتھ منسلک لوگوں نے درمیان میں کہا کہ جس مقصد کے لیے بنا تھا ہم اس طرف جا نہیں رہے تو قرارداد مقاصد بنائی گئی۔ اس میں ان تمام باتوں کا اعادہ ہے جو پاکستان بننے سے پہلے ہوتی رہیں۔ عام لوگوں نے جس جذباتی انداز سے حمایت کی وہی قرارداد مقاصد ہے، بعد میں اسے آئین کا حصہ بنایا گیا۔ اس سے دل تو خوش ہو جاتا ہے لیکن یہ باقاعدہ کوئی تشکیلی خاکہ نہیں دیتا۔ مثلاً ہم کہیں کہ بہت اچھا لنچ ہونا چاہیے یہ ایک دوٹوک بیان تو ہے مگر کوئی تشکیلی خاکہ نہیں۔

سب سے بڑی بات 1973ء کا آئین ہے، اس میں بھی بنیادی بات یہی ہے کہ مملکت کا مذہب اسلام ہوگا، کوئی قانون اسلام کے خلاف نافذ العمل نہیں ہوگا پھر اس کی ذمہ داری اسلامی نظریاتی کونسل کو دی گئی اور ہر ممکنہ کام وہ کر چکی ہے، لیکن اس کی حیثیت مشیر کی ہے، اسے قانونی شکل دینا مقنّنہ کا کام ہے، ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کوئی خلاف اسلام قانون سازی نہیں ہو سکتی لیکن کیا ہمارا نظام اسلام کے ہم آہنگ ہے یا نہیں؟

ہمارا پورا زور قانون سازی پر ہے لیکن ہماری توجہ کبھی معاشرے کی طرف نہیں رہی، چنانچہ قانون سازی میں پاکستان اوورلجسٹریشن ملکوں میں شامل ہے۔ بہت اچھے قوانین بنے جو خوش آیند امر ہے لیکن معاشرہ؟ چھوٹی سی مثال دیتا ہوں کہ، اسلامی بنکاری، تکافل، اسلامی نظریاتی کونسل یہ سب آپشن آج ہمیں دستیاب ہیں لیکن معاشرہ؟ اگر ہم مان لیں کہ یہ جذباتی کیفیت اسلام کے لیے تھی تو کیا بلوچ بیلٹ میں جو کہ پشتون اور بلوچ میں تقسیم ہے اسلام کے لیے کوئی جذباتیت ہے؟ بہت کم ہے۔ اگر ان کے دیہاتی علاقوں میں محمدؐ کے بارے میں پوچھیں تو بہت کم بتا سکیں گے، جب تبلیغی جماعت والے گئے تو نماز سکھائی اور اسلام کی ابتدائی باتیں بتائیں۔ تبلیغی جماعت والے بتاتے ہیں کہ ایسے لوگ تھے جنہیں کلمہ تک نہیں آتا تھا۔ اگر ان سے رسول کا پوچھا جاتا تو کہتے اکبر بگٹی ہمارا رسول ہے۔ پھر ہم پشتون بیلٹ کی طرف آتے ہیں ان میں قوم

پرستی ہے۔اب ہم سندھ کی طرف آتے ہیں، وہاں کے دیہاتی علاقوں کا جائزہ لیں یا پنجاب کے دیہاتی علاقوں میں دیکھیں تو بے شک معمولی خاکہ تو ہے لیکن اندرون پنجاب والوں کے لیے یہ باتیں ناقابل فہم ہیں۔

اس کے بعد پختونخواہ کی طرف آتے ہیں، یہاں دو بیلٹ ہیں :پشتون اور غیر پشتون، غیر پشتون میں آپ کو شاذ و نادر لوگ مذہبی جماعتوں سے وابستہ نظر آئیں گے،ان میں فرقہ وارانہ رنگ تو ہے لیکن سیاسی نہیں۔ لے دے کر صرف پشتون بیلٹ ہے جس کی والہانہ وابستگی ہے اور یہ افغانستان تک ہے۔اس وقت پشتون بیلٹ میں وہاں ارتعاش ہے اور غیر پشتون بیلٹ میں وہاں اقتصادی ترقی جاری ہے۔ یہ چیلنج ہمارے درمیان موجود ہے۔

اس وقت ہم ستر واں یوم آزادی منا رہے ہیں۔اس وقت آپ کی تین جماعتیں قومی سطح پر ہیں، چھوٹی جماعتیں یا قوم پرست ہیں یا سیکولر،لیکن مستقبل تین جماعتوں کا ہے۔مسلم لیگ، پی پی پی،تحریک انصاف۔فکری چیلنج یہ ہے کہ مسلم لیگ کا جو تصور ہے اس کے ساتھ یہ تمام چیلنجز سفر کر رہے ہیں۔ پیپلز پارٹی آیا وہی جذبات رکھتی ہے جو پاکستان کی تشکیل کی بنیاد ہے؟ اور پی ٹی آئی،آیا ان کا ذہن ان چیزوں کے بارے میں واضح ہے؟ کیا ان کے منشور میں یہ ہے؟ کیا یہ اس کا جواب دینے کی پوزیشن میں ہیں؟ ہم نے اس کا جواب تلاش کرنا ہے۔

پیپلز پارٹی کی فکر تو میانے کی تھی،انہوں نے کارخانوں کو اپنی تحویل میں لیا، بہرحال ان کی پالیسیوں میں ایک جوہری فرق ہے کہ مسلم لیگ سے مختلف ہوتی ہیں،تیسری طاقت کے سامنے یہ ابہام موجود ہے۔اگر ہم واقعی اسلامی نظام چاہتے ہیں تو پھر یہاں اسلام کے نفاذ کا طریقہ کیا ہو گا؟ صدارتی نظام یا پارلیمانی نظام؟ چنانچہ ابتدا میں ہم صدارتی نظام اور پھر پارلیمانی نظام کی طرف گئے۔ ہمارے ایک بڑے سکالر عطا الرحمٰن صاحب اب پھر اس کے قائل ہیں، پاک سرزمین پارٹی کا مطالبہ بھی صدارتی نظام کا ہے۔کیا یہ دو طریقے اپنائیں گے یا کوئی اور طریقہ ہونا چاہیے؟

ایک بہت بڑا چیلنج یہ ہے جو ہمارے تعلیمی اداروں میں نوجوان طبقہ خلافت کے تصور سے وابستہ ہو گیا ہے۔ابتدا ضیا دور میں حزب التحریر سے ہوئی تھی اور اب بات داعش تک پہنچ چکی ہے۔ کچھ لوگ پاکستان سے بھی گرفتار کیے گئے ہیں۔ یہ بھی ایک چیلنج ہے۔لگتا ایسا ہے کہ جس نظام کو ہم نے بنایا، اس کے ثمرات سامنے نہیں آئے تو نوجوان اس طرف چلے گئے، یہ ایک رومانوی تصور ہے۔ان مختلف چیلنجز کا ہمارے ملک کو سامنا ہے، ابتداء میں یہ اتنے سنگین نہیں تھے اور اطمینان کی کیفیت تھی، جب ایک ملک کو سیاسی استحکام مل جائے تو باقی باتیں خود بخود شروع ہو جاتی ہیں۔ ہماری تاریخ میں سب سے بڑا چیلنج سیاسی عدم استحکام ہے۔قائداعظم کو زہر دے کر اور لیاقت علی خان کو گولی مار کر شہید کیا گیا۔ پھر مارشل لا،اس کا لازمی نتیجہ مشرقی پاکستان کی ناراضی کی صورت میں نکلا، پھر ہماری عظیم فوج کو شکست کا سامنا کرنا پڑا، آج کا دن بہت بھاری ہے، خدا کرے خیریت سے گزر جائے۔ انڈیا ہم سے بہت بڑا ہے، وہاں صوبے علیحدگی کا مطالبہ کر رہے ہیں، حالت دگرگوں ہے لیکن دنیا میں ان کا نام ہے۔ان کے سفیر کی بات کو احترام دیا جاتا ہے کیونکہ وہاں سیاسی استحکام ہے۔

محمد عامر رانا

بہت شکریہ، آپ نے جامع گفتگو کی، جو کلیدی نکات سامنے آئے کہ آج کی نسل ایک خاص نصاب کی پیداوار ہے، جو نبراسکا یونیورسٹی نے تیار کیا، ہمارے علم میں یہ بھی ہے کہ نبراسکا کے اثرات ہمارے قومی نصاب پر کیسے پڑے، بلکہ کچھ پرائیویٹ مذہبی ادارے ہیں جنہوں نے اسے صرف نام کے فرق کے ساتھ پورے کا پورا نصاب کا حصہ بنا دیا۔ ہماری کوشش رہی ہے کہ پاکستان میں قانون سازی ہو لیکن معاشرے پر کوئی توجہ نہیں دی گئی، ہر گروپ سمجھتا ہے کہ اس کے پاس قوت نافذہ ہو تو وہ سدھار سکتا ہے۔سیاسی نظام کیا ہو؟ سیاسی استحکام کا نکتہ اتنا ضروری ہے کہ سارے چیلنجز اس کے اردگرد گھومتے ہیں۔اب حاضرین سوال یا تبصرہ کر سکتے ہیں۔

تبصرہ: ستر سال بعد بھی پوری تقریر میں مذہب کو بنیاد بنایا گیا، ہم اس سے بیزار نہیں ہو سکتے، ہماری سیاسی جماعتیں ہجوم کے ہاتھوں بلیک میل ہوتی رہیں، آج بھی وہی کیفیت ہے، جہاں خلا پیدا ہوتا ہے وہاں باہر سے چیزیں ضرور ہوتی ہیں، ہم نہ مذہبی بن سکے نہ سیکولر، اس میں قصور سیاستدانوں کا ہے، مذہبی رہنماؤں کا یا آمروں کا؟

سوال: کیا اسلام خود کوئی مذہبی ریاست چاہتا ہے؟ اس کا واضح جواب دیں، اس ساری گفتگو کے بعد اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ لوگ اسلام چاہتے ہیں یا نہیں اس کی ابھی ووٹنگ کروالیں ہال میں، کیا عوام کا یہ کبھی مطالبہ نہیں رہا؟ آپ ہم سے کیا چاہتے ہیں؟

سوال: کیا اسلامی ریاست کے لیے پاکستان تھا؟ صرف گیارہ اگست کی تقریر کے علاوہ سیکولر طبقے کے پاس کوئی دلیل نہیں۔ مذہبی طبقے کی رائے کو مسلم اکثریتی علاقوں نے مسترد کیا۔ بلوچ کو تین حصوں میں تقسیم کیا جائے، آپ گڈمڈ کر رہے ہیں، دینی جماعتوں بالخصوص جے یو آئی کا اثر بلوچوں میں بڑھ رہا ہے،، مذہبی ووٹ پنجاب میں کم ہوا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب قرارداد مقاصد بنی تو غیر مسلم نمائندوں نے تقاریر کیں، انہیں بار بار یہ یقین دلایا گیا کہ آپ کے حقوق کا تحفظ کیا جائے گا اس لیے کسی نے مخالفت نہیں کی تھی، واک آوٹ کر گئے تھے۔

سوال: چین نے ترقی کی، اس کی بنیادی وجہ ان کی زبان ہے، اردو کو یہاں ترقی نہیں دی گئی، کالجوں اور مدارس کا نصاب مختلف ہے، ہم کہتے ہیں پانی مرکب ہے وہ کہتے ہیں مفرد ہے۔ ضیا کے دور میں وہ طالبان مجاہد تھے، اب دہشت گرد ہیں، میں نے خود اس جہاد میں حصہ لیا، پہلے وضاحت ہونی چاہیے کہ جہاد اور دہشت گردی کی تعریف کیا ہے۔

سوال: پوچھنا یہ تھا کہ اگر قائداعظم نے اسلامی ریاست ہی کی بنیاد رکھی تھی تو اس وقت ان کے سامنے کون سا ماڈل تھا؟

تبصرہ: ہم نے اگر معاشرے کو کچھ دیا ہوتا تو دوسرے لوگ نہ ہوتے، کیا ہم اس خلا کو اب بھی

پر کرنے پر آمادہ ہیں؟ اس سلوگن کو کسی شکل میں سامنے لے آئیں تا کہ لوگوں کو اطمینان آئے۔

جوابات: پہلے سوال میں بڑی اچھی باتیں کی گئیں اور زیادہ تر میری معروضات کا حوالہ دیا گیا، میں الفاظ کے انتخاب میں محتاط ہوتا ہوں، سوال بہت زبردست ہے کہ سیاسی جماعتوں کا کیا کردار ہونا چاہیے، ہماری تحدیدات میں یہ بہت بڑا چیلنج ہے کہ ہماری جماعتیں منیر نیازی کے اس شعر کی مصداق ہیں

کجھ شہر دے لوگ وی ظالم سن
کجھ سانوں مرن دا شوق وی سی

یہ کشمکش ابتدا سے ہے اور آج عروج پر ہے، ہمارے نصاب نے ہم سے یہ سوال چھین لیا ہے کہ جس کا کام اس کو ساجھے۔ جس کا کام سرحدوں کی نگرانی ہے ان کو نصاب کی ذمہ داری نہیں سونپنی چاہیے، گملوں میں سیاست دانوں کے اگانے نے بہت نقصان پہنچایا، اس وقت بھی یہ کوشش ہو رہی ہے، کچھ غلطیاں سویلینز کی بھی ہیں لیکن خارجی دست اندازی بھی موجود ہے۔

دوسرا سوال ہے کہ اسلام کیا چاہتا ہے؟ اس کا جواب نہ مختصر ہو سکتا ہے نہ فوری، اسلام کا نظام اس وقت نہ قومی ریاستیں تھیں نہ پارلیمانی۔ کیا ہم ایسا نظام لا سکتے ہیں کہ ون مین ون ووٹ نہ ہو، ایران نے جو نظام بنایا وہ بہت شاندار ہے، انہوں نے ولایت فقیہ کا تصور دیا، کیا ہم کوئی ایسا نظام لا سکتے ہیں؟

اس کے بعد کے سوال کا جواب گفتگو میں آ گیا ہے، میں نے اشارہ کیا کہ تبدیلی آ رہی ہے، قلات میں بھی جے یو آئی کا اثر بڑھ رہا ہے، لیکن پہلے علاقے یہیں تھے۔

اردو سے ترقی والا سوال موضوع سے متعلق نہیں ہے۔ اس کو بھی چیلنج کے طور پر لے لیں، ایک دور مقامیت کا تھا جس میں لوگ زبانوں کی طرف جاتے تھے، افغانستان کے حالات کے بعد عالمگیریت اور اب ہم مابعد عالمگیریت کی طرف جا رہے ہیں، روس میں روسی زبان میں مقالہ لکھنا

شرط تھا، اب ختم کر دی گئی، چین بڑی تیزی سے انگریزی کی طرف جا رہا ہے، اب رفتہ رفتہ مقامیت کا تصور ختم ہو رہا ہے۔ میں نے ایچ ای سی کو خط بھی لکھا کہ پوسٹ سی پیک نظام بنائیں۔

افغان طالبان اور دہشت گرد بھی ایک الگ موضوع ہے، ہم وقت کو روک نہیں سکتے ہمیں وقت کے مطابق چلنا ہے، ہم ٹی وی پر پابندی نہیں لگا سکتے، وقت کے ساتھ ہم نے سفر کرنا ہے۔

یہ سوال بھی بنیادی ہے کہ کہاں سے ہمارا مسئلہ شروع ہوا، ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ قومیں اور افراد اپنے لیے ایک ویژن کا تعین کرتے ہیں، اہداف اور پالیسیاں بناتے ہیں۔ مثلاً PIPS کا اپنا ایک ویژن ہے اور یہ اسی کے اندر رہ کر کام کر رہا ہے، فرد کا بھی ویژن ہے۔

اگر پاکستان کا ابتدا ہی سے ویژن ہوتا اور ریاست اس بات کو طے کرتی اور آئین کا حصہ بناتی تو پورا میڈیا اور ملک اسی کے حصول کی طرف جاتا۔ ایک اساسی قدر یہ ہے جیسا کہ رانا صاحب نے اس گفتگو کے آداب کے ضمن میں کہا کہ جواب الجواب نہ ہو۔ اسی طرح قوموں کے اساسی اقدار ہوتے ہیں، اس کے لیے ڈاکٹر اسد کی قیادت میں ایک کمیٹی بنائی گئی تھی، مجھے یقین ہے کہ ان کا ویژن اور پالیسی ہمارے کاغذات میں موجود ہوگی۔

اگلے سوال کا جواب بھی آ گیا ہے، یہ دور سیاسی استحکام کا ہے، سورہ قریش میں بہت خوبصورتی سے زنجیر بنا دی گئی ہے، لایلف قریش۔ یہ زنجیر قوموں کی ترقی کے لیے بہت اہم ہے سیاسی استحکام سے اقتصادی ترقی ہوگی۔ سنگاپور، اسلام آباد سے کچھ بڑا ہے لیکن اس کی آواز پوری دنیا میں سنی جاتی ہے۔ ڈاکٹر حسن عسکری رضوی کا مقالہ 'ملٹری اسٹیٹ انٹرنیشنلی' پاکستان کو سمجھنے کے لیے اسے بہت اہم سمجھا جاتا ہے، اسی طرح 'پاکستان اے ہارڈ کنٹری' کا مطالعہ بھی بہت مفید رہے گا۔

سوال: قانون سازی کی بات ہوئی، قانون سازی ہوتی ہے لیکن عمل کہیں نہیں ہوتا، انتہا پسندی کی وجہ بے مقصد زندگی بھی ہے۔ ہر ادارے میں ناانصافی ہے۔ طاقتور لوگ قانون کو جالے کی طرح توڑ دیتے ہیں، ایک عام آدمی کو چھوٹے سے کام سے تھانے جانا ہو تو ٹانگیں کانپ جاتی ہیں۔ ایک نصاب بیکن ہاؤس میں پڑھایا جاتا ہے اور ایک اردو میڈیم اور سرکاری سکولوں

میں، یکسانیت کہاں ہے؟ ایک خوبصورت نعرہ دیا جاتا ہے کہ پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ، پاکستان کدھر ہے، لا الہ الا اللہ کدھر ہے؟

تبصرہ: میرے خیال میں سماجی ہم آہنگی میں دو بڑی رکاوٹیں مذہب اور نظام تعلیم ہے، لیکن اس کے علاوہ، بنگالی اردو تنازعہ، پھر علاقائی تنازعات بھی ہیں۔

تبصرہ: اسلامی نظام کی بات ہوئی، میرے خیال میں اس کی بجائے اسلامی فلاحی ریاست کی بات کی جائے تو زیادہ بہتر ہے، جو لوگ بھی مغرب میں رہ کر آتے ہیں تو آ کر وہاں کے سسٹم کی تعریف کرتے ہیں، اگر ہم فرض کر لیں کہ وہ اسلامی ممالک ہیں تو سب کچھ وہاں موجود ہے۔ آپ نے عیسائیوں کو مسجد نبوی میں عبادت کا موقع دیا، ہم تو ان کو ان کی اپنی عبادت گاہوں میں عبادت بھی برداشت نہیں کر سکتے۔

تبصرہ: ہمارے موضوع پر بہت کم توجہ دی گئی، امید ہے کہ اب ہوگی، حالات تبدیل ہو رہے ہیں۔ جو لوگ سیاست کو کفر کہتے تھے انہوں نے بھی اسی ہفتے سیاسی جماعت بنالی، ہر چیز تبدیل ہو رہی ہے۔

سوال: کیا ہم دنیا کی دوسری قوموں میں منفرد ہیں جو ہمیں چیلنجز کا سامنا ہے؟

جوابات: گفتگو سے زیادہ سوالات کا مزہ آ رہا ہے، قانون سازی ہے لیکن اطلاقی پہلو نہیں ہے، یہ بالکل حقیقت ہے، میں اسے دوسرے سوال کے ساتھ ملاؤں گا، فلاحی ریاست کیسے بنتی ہے؟ ہم نے یہ سوچنا ہے کہ بہتری کے لیے جو ہمارے پروگرام ہیں ان کے سامنے سب سے بڑی رکاوٹ کیا ہے؟ اس کا تعین کر کے ہم بہت سے سوالوں کا جواب دے سکتے ہیں۔ قوانین کے اطلاقی حوالوں کو مضبوط بنانے کے لیے اگر خزانے کا رخ عوم کی طرف کر دیا جائے تو پھر معاشی سرگرمی کے فائدے از خود عوام تک پہنچیں گے، پھر شناخت کا مسئلہ نہیں ہوگا، یہ مسائل محرومیوں سے آتے ہیں۔ بنگالی زبان کا مسئلہ بھی محرومی سے آیا۔ اب ہمارے ہاں رخ عوام کی طرف نہیں ہے، ہم فلاحی ریاست نہیں سیکورٹی ریاست ہیں۔ فلاحی ریاست کا مظہر عوام میں نظر آتا ہے، جس ہوٹل میں

آپ داخل ہوں تو تین دفعہ تلاشی ہو تو یہ فلاحی ریاست نہیں سیکورٹی ریاست ہے۔عوام کی زندگی بہتر ہو، ہر جگہ سکول ہو، شہری سہولیات ہوں یہ تب ہوگا جب آپ کے خزانے کا رخ عوام کی طرف ہو، اس کا رخ کہیں اور ہے۔

ایک سوال یہ تھا کہ ہم پورا ماڈل کیوں نہیں دیتے؟ جمہوریت کوئی مثالی نظام نہیں لیکن موجودہ نظاموں میں نسبتاً بہتر ہے۔ بڑے لمبے عرصہ بعد ہمیں یہ نظام ملا ہے، مغرب میں مذہب کا سلسلہ نہیں ہے، تو لازماً ہمیں اپنے ثقافتی و مذہبی اقدار کو اس میں رکھنا ہے، عربوں اور ترکوں کی اپنی تاریخ ہے، پھر صوبوں کی ایسی تقسیم نہیں ہے، قومیت کا مسئلہ نہیں ہے سوائے کردوں کے، ہم نے یہ مسئلے اپنے حالات کے مطابق ازسرِ نو ترتیب دینے ہیں۔

دیگر اقوام سے منفرد ہونے والے سوال کے ضمن میں عرض ہے کہ یہ اور قوموں کے مسئلے بھی ہیں لیکن وہاں حل تلاش کیا جاتا ہے ہم دباتے ہیں، یا قتل کر کے یا لاپتا کر کے، انڈیا میں بھی زیادہ ہیں، شناخت کا مسئلہ، عراق میں اکثریت شیعہ تھے اور صدام نے انہیں دبا کر رکھا، پھر شیعہ آئے تو سنیوں کو دبایا اور ردعمل میں داعش وجود میں آ گئی۔اس میں کوئی شک نہیں کہ دردسر کی حیثیت ہماری تاریخی ہے، کاش دانش والے لوگوں کو اجازت مل جائے کہ خارجہ پالیسی بنا سکیں۔

محمد عامر رانا

جہاں سپیڈ بریکر ہوتے ہیں وہاں ذہنی بریکر بھی ہوتے ہیں۔گیارہ اگست کی تقریر پارلیمانی تھی اس لیے اس کی اہمیت ہے، مذہب ایک شناخت کا مسئلہ تھا کہ مسلم شناخت، اس تقریر کے کلیدی نکات وہی ہیں، تمام مذاہب کو تحفظ دیا جائے گا، آزادی دی جائے گی، کیا اسے ٹیگ دیا جائے سیکولرازم کا؟ یا میثاق مدینہ کا؟ دنیا میں جو بھی اس مرحلے سے نکلے ہیں، وہ اختیار اور وسائل کی تقسیم سے نکلے ہیں۔ایتھوپیا جیسا ملک جہاں قحط کا تصور ہے وہاں ترقی کی شرح چھے فیصد ہے۔سماجی ہم آہنگی کی ضرورت کیا ہے؟ پاکستان میں ہمیں مسلکی ہم آہنگی بھی چاہیے، قوموں کے

مہذب ہونے کا ایک پیمانہ یہ بھی ہے کہ وہاں سماجی ہم آہنگی کیا ہے؟ جب عالمی سطح پر ملکوں کی درجہ بندی ہوتی ہے تو یہ کوئی جذباتی عمل نہیں ہوتا۔آپ کے دوسرے ملکوں اور قوموں کے ساتھ تعلقات کو، آپ کی معیشت اور نظامِ حکومت کو دیکھا جاتا ہے، سماجی ہم آہنگی کو دیکھا جاتا ہے کہ تمام زبانوں اور مذاہب کے لوگ کیسے رہ رہے ہیں؟ اقلیتوں کے حوالے سے جب جبر کی آواز آئے گی تو آپ یہی تصور لیں گے کہ یہ مثالی معاشرہ نہیں ہے۔اسی لیے ہمارا نمبر 134 کے بعد آتا ہے۔

ڈاکٹر قبلہ ایاز

پاکستان کے ویژن کے تصور میں ترانہ بڑا اہم ہوتا ہے، پاکستان کے قومی ترانہ کے مقاصد طلبا کو بتائے جائیں، اقلیتوں کو صرف تحفظ حاصل نہیں ہوگا بلکہ برابر کے حقوق حاصل ہوں گے بلکہ بعض موقعوں پر زیادہ دینا بھی ضروری ہے، جب افغانستان میں طالبان کی حکومت تھی تو ان کے ترانہ میں ہم خوشحالی چاہتے ہیں نہیں تھا لیکن نئے ترانے میں یہی چیز نظر آئی۔یہ ترانہ فارسی اور پشتو کا مرکب ہے، کہ ہم چاہتے ہیں کہ آس پاس کے ملکوں کے ساتھ ہمارے بہتر تعلقات ہوں، اللہ اکبر کے ساتھ اس کا اختتام ہوتا ہے،۔ یہ بہت ضروری ہوتا ہے کہ قومی ترانہ کے مقاصد بتائے جائیں۔

دوسری نشست

نصاب اور تعلیم

مولانا عمار خان ناصر

جو عنوان گفتگو کے لیے مجھے دیا گیا ہے کہ تعلیم کے عمل میں معاشرے میں رواداری کے فروغ میں استاد یا نصاب میں کون زیادہ مؤثر ہے؟ اس بحث کا ایک نکتہ تو بہت واضح ہے کہ عمل تدریس

میں کون سے عناصر ہوتے ہیں اور ان کا کردار کیا ہوتا ہے؟ کسی ایک کو کہنا کہ یہ کم مؤثر ہے مشکل ہے، سارے عناصر مل کر کام کرتے ہیں، استاد کا اپنا پایہ کیا ہے، اس کا رویہ کیا ہے ان سب سے ہم واقف ہیں۔

میں اس بحث کو ایک اور طرح سے تدریسی اخلاقیات سے جوڑ کر پیش کروں گا، ہماری اسلامی تہذیب کی جو علمی روایت رہی ہے اس میں استاد یا مصنف کا جو علمی موضوع کی تفہیم کر رہا ہے اس کی اخلاقیات میں ایک بنیادی اصول یہ ہوتا ہے کہ استاد کا مقصد اپنے نتائج یا تعصّبات کو منتقل کرنا نہیں، اس کی ذمہ داری یہ ہے کہ موضوع کی پوری علمی تفہیم سامنے رکھے، اس موضوع پر اس کا اپنا نقطہ نظر بھی ہوسکتا ہے لیکن وہ اپنے منصب کو اس کے لیے استعمال نہیں کرے گا، وہ مسئلے کی پوری تفہیم کرائے اور طلبہ کو اس قابل بنائے کہ سارے نقطہ ہائے نظر سے واقف کرے اور اس کے ضمن میں اپنے نقطہ نظر کے دلائل فراہم کرے۔

اس لحاظ سے وہی اخلاقی اصول لاگو ہوتا ہے جو حکومتی مناصب پر ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ آپ کو کوئی منصب دیا گیا ہے تو آپ اسے ذاتی فائدے کے لیے استعمال نہیں کریں گے۔ استاد کا منصب بھی اس سے مختلف نہیں ہے۔ اگر آپ نے ذاتی حیثیت میں کوئی درسگاہ کھولی ہوئی ہے اس کی نوعیت مختلف ہے لیکن جیسے ہی آپ کو کسی ادارے میں منصب اور تدریس کا عمل دیا گیا ہے تو اس کے ذریعہ اپنے رجحانات کو منتقل کرنا علمی اخلاقیات کے منافی ہے۔

حتیٰ کہ ہمارے ہاں اسلامی تہذیب میں جو حساس دائرہ ہے گفتگو کا وہ علم الکلام ہے جس میں مابعد الطبیعی بحث کی گئی ہے، اس میں بھی ایک خاص روایت رہی ہے کہ وہ پہلے پورا نقطہ نظر بیان کرتے ہیں اور بعد میں اپنا نظریہ بیان کرتے ہیں، امام اشعری کی ایک کتاب مقالات الاسلامیین میں جو بھی کلامی سوالات اٹھائے گئے ہیں، یہ واضح کیا گیا ہے کہ سارے ریکارڈ کو یکجا کرنا مقصد ہے کہ کیا نقطہ ہائے نظر رہے۔

ہم تھوڑا آگے آئیں تو ایک اور متکلم اور فلسفہ کے ناقد امام غزالی کو دیکھتے ہیں کہ تنقید لکھنے سے

پہلے انہوں نے الگ ایک کتاب لکھی، تہافت الفلاسفہ سے پہلے مقاصد الفلاسفہ لکھی اور اپنے فہم کے مطابق صرف فلسفہ کے مکاتب فکر اور استدلال لکھا، اس کے بعد تنقید کی۔

امام رازی اشعری علم الکلام کے بڑے نمائندہ ہیں، وہ اپنی کتابوں میں مخالف فریق کے مؤقف کو اتنی وضاحت سے پیش کرتے ہیں کہ جو دلائل انہوں نے نہیں دیے وہ بھی خود سے پیش کرتے ہیں اور اپنے موقف کو سرسری سا پیش کر کے گزر جاتے ہیں، یہ ذہنی رویے کی بات ہے، ایک مصنف یا استاد کا کام فہم کو بہتر بنانا ہوتا ہے نہ کہ اپنے تعصّبات پر قائل کرنا، وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کی اپنی بات میں بھی کوئی وزن ہے تو پہلے مخالف کی پوری بات سامنے آئے۔

ہمارے ماحول میں جو بھی بحثیں چل رہی ہیں، اساتذہ بھی ان سے متاثر ہوتے ہیں اور کوئی ایک پوزیشن اختیار کرتے ہیں، سیاسی، مذہبی بحثیں، اساتذہ اپنا رجحان جو بھی رکھیں اس بات کو ملحوظ رکھیں کہ وہ اپنے نقطہ نظر کے مبلغ نہیں ہیں، اگر وہ اپنا نقطہ نظر پیش کرنا ضروری سمجھیں تو پیش کریں مگر موضوع کی پوری تفہیم کے بعد۔ مختلف پارٹیوں کے رجحانات کی تفہیم کرنے کے بعد مناسب طریقے سے اپنا نقطہ نظر بیان کرے۔ استاد اگر یہ اخلاقی اصول اختیار کرلے تو پوری نسل جو سامنے بیٹھی ہے اس کے رویے میں ہم آہنگی پیدا کرنے میں یہ بہت اہم ہوگی۔

ایک ہی مسئلہ پر مختلف آرا کیسے سامنے آگئیں؟ اس کو سمجھائے اور اس سے مشترکات کو تلاش کرنے کا رویہ پیدا کرے، اگر استاد ہی فریق بن جائے تو اس نے وہ رویہ پہلے ہی مرحلہ پر ختم کر دیا جو اس کی ذمہ داری تھی۔ عصری تعلیمی اداروں میں تقرری اس بنیاد پر نہیں ہوتی بلکہ سمجھا یہی جاتا ہے کہ اس مضمون پر غیر جانبدار ہو کر بیان کریں گے، اس کا شعور بسا اوقات نہیں ہوتا۔

ہمارے مدارس میں جانبداری کو ادارہ جاتی رویہ بنا دیا گیا ہے، وہ پہلے ہی بتاتے ہیں کہ فلاں مکتب فکر کا دینی ورژن پڑھائیں گے، پہلے ہی بتاتے ہیں کہ یہ ہمارا مسلک ہے، بلکہ بعض تو مخصوص نظریات پر حلف لیتے ہیں کہ کیا آپ ان کے پابند ہیں؟ بعض امتحانی بورڈز نے یہ شرائط بھی رکھی ہیں کہ کل اگر آپ ان مخصوص نظریات سے منحرف ہو جائیں تو ہم آپ کی سند کو کینسل کر

سکتے ہیں۔ یہ ہونا چاہیے یا نہیں؟ اس پر بھی بحث ہوسکتی ہے۔

استاد اپنے آپ کو صرف نصابی کتاب تک محدود نہ رکھے بلکہ اس موضوع پر اور بھی کتابیں پڑھے تاکہ اسے نصابی خامیوں سے بھی آگاہی ہو، نصاب سازی تعلیمی اصولوں پر ہو اس کو ابھی وقت لگے گا لیکن استاد اگر اپنے آپ کو اپڈیٹ رکھتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ ایک ورژن نصاب میں دیا گیا ہے تو وہ دوسرا بھی پیش کرسکتا ہے، اسی سے رویے اور کردار سازی کا عمل آگے بڑھتا ہے۔

میں نے جو سوال قبلہ ایاز صاحب کے سامنے رکھا وہ بنیادی ہے اس پر ہم سب کو غور کرنا چاہیے۔ چیلنجز اور مسائل تو ہر معاشرے کا حصہ ہیں، کوئی معاشرہ ایسا نہیں ہے جسے آگے بڑھنے کے لیے کوئی مسائل نہیں ہوں، ترجیحات کے تعین کے سوال سے کوئی معاشرہ خالی نہیں ہوسکتا، نوعیت اور سنگینی مختلف ہوسکتی ہے، کچھ معاشرے بنیادی سوالات اٹھاتے ہوں اور کچھ آگے بڑھ چکے ہوں۔ مشکلات کا ہونا کوئی انہونا نہیں ہے، ہمیشہ معاشرے کو مسائل کا سامنا ہوتا ہے، دنیا میں جو تبدیلیاں آئی ہیں وہ اسی طرح آئی ہیں۔ ہمارے ہاں بہت توڑ پھوڑ ہوئی ہے، ہمیں وقت لگے گا اور تجربات سے گزر کر ہم جگہ پر نہیں پہنچیں گے تو بنے بنائے جوابات ہمارے مسائل حل نہیں کر سکتے۔

یہ ہر جگہ سوال ہوتا ہے کہ ستر سال ہو گئے ہمارا یہ مسئلہ حل نہیں ہوا، یہ مایوسی کے انداز میں سوال ہے، سوشل سائنسز کے اساتذہ کو اس کا شکار نہیں ہونا چاہیے، اگر تبدیلی نہیں آئی تو وہ رکاوٹیں کیا ہیں؟ اساتذہ کا اندازِ فکر صحافیوں سے مختلف ہونا چاہیے۔ اساتذہ ان موضوعات کو خود گہرائی سے سمجھیں اور صبر و تحمل سے تجزیہ کریں اور طلبہ میں بھی گہرائی پیدا کریں۔ نعرے بازی سے مسائل حل نہیں ہوں گے۔

ایک بات میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ نوجوان نسل میں اور باقی لوگوں میں فرق ہوتا ہے، نوجوان نسل متبادل تلاش کرے گی، اسے اس مایوسی اور ناامیدی سے بچانا اور یہ ادراک پیدا کرنا

کہ مستقبل آپ کی ذمہ دارانہ شراکت سے بہتر ہوگا، ان کے سامنے امید رکھیں۔ ماضی کے واقعات سے نہیں بلکہ آج کی دنیا سے کچھ ایسی چیزیں اکٹھی کریں جن سے ان کو بتا سکیں کہ سماج کے سوچنے سمجھنے والوں نے کیسے تبدیلی لائی۔

کل ہی میں جھنگ کے ایک دوست سے پوچھ رہا تھا کہ اب وہاں پر امن و امان کی کیا صورتحال ہے؟ ان کا جواب تھا کہ صورتحال بہت بدل چکی ہے، ہم اپنے معاشرے پر بھی غور کر سکتے ہیں۔ فکری سوالوں کے بعض جوابات وقت مانگتے ہیں، لیکن ہم اپنے طلبہ کو مثبت رویہ دیں، وہ ساری توقعات حکومت سے وابستہ کرنے کی بجائے دیکھیں کہ وہ خود کیا کر سکتے ہیں؟ میں انہیں بنیادی نکات پر اکتفا کروں گا۔

محمد عامر رانا

بہت شکریہ، آپ نے تدریس کے لیے ایک اخلاقی اصول بتایا کہ استاد اپنے رجحانات کی تبلیغ نہیں کرتا، اور دوسرا یہ کہ چیلنجز کا ہونا کوئی مسئلہ نہیں، اب میں ڈاکٹر حسن الامین صاحب سے گزارش کروں گا کہ وہ ہمیں بتائیں اساتذہ تبدیلی میں کیا کردار ادا کر سکتے ہیں؟ اور تبدیلی سے کیا مراد ہے؟ آپ ادارہ اقبال تحقیق و مکالمہ کے ڈائریکٹر ہیں، حال ہی میں آپ کی ایک کتاب ''پوسٹ اسلام ازم'' کے نام سے آئی ہے۔

تبدیلی میں اساتذہ کا کردار

ڈاکٹر حسن الامین

عمار صاحب کی گفتگو کے بعد بات کرنا جسارت ہوتا ہے، بہرحال میں کوشش کروں گا کہ اپنے موضوع پر ٹوٹی پھوٹی گزارشات پیش کروں۔ اساتذہ کرام معاشرے میں ایک اعلیٰ علمی طبقے میں شمار ہوتے ہیں، وہ اپنے علم کی بنا پر عام آدمی سے اوپر اٹھ جاتے ہیں اور اس میں ہم سب شامل

ہیں۔تعلیمی ادارے کی پوزیشن سماجی ہے نہ کہ تجارتی، کیونکہ یہ عوامی سرمائے سے چلتے ہیں،ٹیکس ہو یا والدین کی فیس دونوں لحاظ سے یہ عوامی سرمایہ ہے۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ تبدیلی سے ہم کیا مراد لیتے ہیں؟ یہ ایک متنازعہ موضوع ہے،تبدیلی کیا ہے؟ کس سمت میں ہونی چاہیے؟ تبدیلی اور روایت کا کیا تعلق ہے؟ جوں جوں آگے بڑھتے ہیں تو مذہب اور روایت سے جو فاصلہ بڑھتا ہے اس کی سمت کیا ہے؟ حوالے کا مقام کیا ہے؟ کس زاویے سے تبدیلی کے خواہاں ہیں؟ ترکی ماڈل ہے یا مدینہ یا برطانیہ؟

اس معاملے کو تھوڑا قابل فہم بنانے کے لیے میں پروفیسر امرت کا فریم استعمال کرتا ہوں،ان کے خیال میں آزادی کو وہ مختلف انداز میں بیان کرتے ہیں، وہ مادی ترقی کو ترقی نہیں کہتے، بلکہ انسان کی بطور انسان ترقی، سماجی انصاف، مجموعی آزادی میں اگر اضافہ ہو رہا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ ہم ترقی کر رہے ہیں،اگر ہم سعودی عرب اور فرانس کی فی کس آمدنی کا موازنہ کریں تو سعودی عرب آگے ہے لیکن کیا وہ ترقی یافتہ ہے؟

میں ایک خاکہ بیان کرتا ہوں پانچ چیزوں کا۔پہلی ہے سیاسی آزادیاں، یہاں جمہوریت کا ایک تصور ہے، جمہوریت پر ایک عالمی اجماع وجود پذیر ہو گیا ہے۔اس میں دو تین قسم کی مزید چیزیں ہیں جیسے جمہوری کلچر ہونا، یہ ممکن ہے کہ سیاسی جمہوریت نہ ہو کسی ملک میں لیکن جمہوری کلچر ہو، یا اس کے برعکس بھی۔

سوال پوچھنا، بات چیت کرنا،ایک لفظ میں اسے 'کانسٹیٹیوشنل ازم' کہہ سکتے ہیں۔ پھر ریاست سے ہمارا کیا تعلق ہے؟ شہریت کیا چیز ہے؟ شہری کے کیا حقوق ہوتے ہیں؟ جوڑنے والی چیز جیسے ترانہ اگر آپ اسے ڈھا دیتے ہیں تو پھر کچھ نہیں بچتا۔

ہم گزشتہ دس پندرہ سالوں میں شہری ہو گئے ہیں،شہر کاری کے عمل میں معاشرہ ایک طرح کے دردزہ سے گذرتا ہے۔ کچھ لوگوں کی آمدنی بڑھ جاتی ہے، گاڑی لے لی لیکن ٹریفک کے اصول نہیں پتا، مردان کا واقعہ بھی اس کی مثال ہے، پڑھے لکھے نوجوانوں نے القاعدہ جیسا کام کیا۔

جس طرح افراد کے مسائل ہیں اس طرح قوموں کے بھی مسائل ہیں۔سی پیک کے بھی مسائل ہیں۔ پورے معاشی عمل کو کیسے الگ کیا جا سکتا ہے؟ یہ وہ شعور ہے جو جاننا چاہیے۔میرے پاس ایک طالب علم کا مقالہ تھا سی پیک پر، جی ایچ کیو سے آرڈر آیا کہ ان موضوعات پر کام نہ کریں۔

شفافیت چوتھا موضوع ہے، جتنے لوگ اس سے واقف ہوں گے، کرپشن میں کمی آئے گی، کے پی میں اب لوگ سوال کر رہے ہیں کہ جج کیوں دو گاڑیاں استعمال کر رہا ہے۔اس کا تعلق گورننس اور گڈ گورننس کے ساتھ ہو جاتا ہے۔اقلیتوں اور نظر انداز شدہ طبقات کو کیسے فلاح کے دائرے میں لائیں؟ اس میں استاد اپنا کردار ادا کر سکتا ہے۔

محمد عامر رانا

ڈاکٹر صاحب نے بہت اہم گفتگو کی،اب حاضرین اگر سوالات یا اپنے تجربات بیان کرنا چاہیں تو صلائے عام ہے۔

سوال: استاد تمام وابستگیوں سے بالاتر ہو کر درسگاہ میں جائے، یہ درست ہے لیکن نصاب سے ہٹنا تو بہت خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔کیا نصاب میں تبدیلی نہیں ہونی چاہیے؟

سوال: جذبات سے عاری حیوان ہی ہو سکتا ہے، جب کوئی موضوع پڑھائیں گے تو بات پہنچائیں گے تو سہی لیکن اسے بے نتیجہ چھوڑیں تو بات کیسے مکمل ہو سکتی ہے؟

سوال: جتنے بھی مصنف اور کتابیں ہیں وہ غیر ملکیوں کی ہیں، وہ ان کے کلچر کے مطابق ہیں، کیا ہمیں اپنے کلچر کے مطابق نصاب نہیں تیار کرنا چاہیے؟ دوسرے باہر کا ماحول بھی تو اثر انداز ہوتا ہے، ہم مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے، یہ اللہ کا کرم ہے ہمارا کمال نہیں، استاد کے ذہن میں جو نظریات بچپن سے ہیں ان کے ختم کرنے کے لیے بھی کچھ ہونا چاہیے۔

جوابات

عمار خان ناصر

ہماری گفتگو میں جو بات آئی، استاد اپنی ذمہ داری نبھانے کے لیے تیار ہے اس پر ہم یہ بات کر رہے ہیں۔ اگر ہم بطور طبقہ یا فرد تیار نہیں ہیں تو یہ بات نہیں ہو سکتی۔ اساتذہ کے لیے بعض موضوعات پر بات کرنا مشکل ہے جیسے اسلام اور تاریخ، جو چیزیں نصاب میں نہیں ہیں یا غلط ہیں تو استاد کا اگر مطالعہ مکمل ہے تو وہ اس پر بات کر سکتا ہے اور اس پر اٹھنے والے سوالات کا سامنا بھی کر سکتا ہے۔

ہماری نسل میں جو تبدیلیاں آئی ہیں ان میں سے ایک مثبت تبدیلی کشادہ ذہنی ہے۔ میں نے مطالعہ پاکستان پڑھائی ہے، نائن الیون، اور نیشنل ازم وغیرہ پر میں نے کھل کر بات کی ہے۔ کسی موضوع کو مکمل کرتے وقت استاد اپنی رائے بھی شامل کر سکتا ہے لیکن ایک امکانی نقطہ نظر کے طور پر۔ طالب علم میں تنقیدی سوچ پیدا کرنی چاہیے، وہ استاد کی رائے کا احترام استاد کی خواہش پر کرتا ہے۔ ہم باہر سے بنے ہوئے نصاب پڑھاتے ہیں، بہت کمی ہے، اساتذہ سے بہتر کوئی طبقہ نہیں ہے جو اس میں کردار ادا کر سکے۔

مدارس سے پڑھ کر نکلنے والے کیا مثبت کام کر سکتے ہیں؟ اس میں جو وسعت کے ساتھ پڑھ کے آئیں ان سے کوئی مسئلہ نہیں بنے گا۔ دینی مدارس کے نظام پر ہماری یہ بنیادی تنقید ہے کہ مجموعی روایت کے لیے تیار نہیں کرتی بلکہ کسی خاص ورژن کے لیے تیار کرتی ہے۔

ڈاکٹر حسن الامین

کچھ چیزیں ہیں جنہیں آپ مسترد کر سکتے ہیں۔ میں نے ایک سٹوڈنٹ کو بی گریڈ دیا تو ڈین نے کہا کہ اسے فیل کر دیں، میں نے ان کی رائے کو مسترد کیا۔ کچھ چیزیں ہیں جنہیں آپ گفت و شنید سے حل کر سکتے ہیں، اور کچھ چیزیں ہیں جن پر خاموش رہنا بہتر ہوتا ہے۔ اس ملک میں دو سو یونیورسٹیاں بن چکی ہیں، بہت تبدیلی آ رہی ہے۔

محمد عامر رانا

ایک اندازے کے مطابق 2014ء میں ساڑھے تین ہزار کتابیں لکھی گئیں۔ ان میں سے تین طبعی سائنس سے متعلق تھیں، ادبی کتابوں میں بھی دو یا تین نثر پر تھیں، زیادہ مذہبی لکھی گئیں وہ بھی علمی نہیں، فضائل پر۔ سب سے زیادہ ہلاکتیں فرقہ وارانہ فسادات کی بنا پر ہوئیں، ہم پاکستانی ہیں ہمیں اس کو بہتر بنانے کے لیے کردار ادا کرنا ہوگا۔ گفتگو کے اگلے دور میں آپ اپنی رائے بھی دیجیے۔

تبصرہ: میں نے بچوں سے پوچھا کہ آپ کے سامنے اگر کوئی قرآن جلائے تو کیا کریں گے؟ ستر کی کلاس کا ایک ہی جواب تھا کہ مار دیں گے، ہمارے پرنسپل پر بھی قاتلانہ حملہ ہوا، جتنا بھی ہم بچوں کو سمجھائیں دوسری طرف ریاست بھی کردار ادا نہیں کر رہی، اگر ایک یا دو صحیح ٹرائل ہو جائیں تو بھی یہ ختم ہو جائے گا۔

تبصرہ: ہم تعلیم کی مقدار پر بات کر رہے ہیں معیار کوئی نہیں دیکھتا، ایم اے انگلش فرسٹ ڈویژن میں پاس کرنے والی لڑکی استاد بننے کے لیے آئی تو اسے Schedule کے سپیلنگ نہیں آتے تھے۔ معیار پر توجہ دینے کی بھی بہت ضرورت ہے۔

سوال: عمار صاحب نے اپنی گفتگو میں معتزلہ اور اشاعرہ کا ذکر کیا، اس کی ذرا وضاحت ہو جائے۔

جوابات

عمار خان ناصر

محض نصاب کا مسئلہ نہیں، طبقاتی تنوع بھی ہے، زیادہ وقت طالب علم باہر گزارتا ہے۔ بات یہ نہیں ہو رہی کہ صرف استاد کی ذمہ داری ہے اور کوئی عوامل نہیں ہیں، ہدف یہ نہیں کہ اساتذہ کے پاس کوئی اکسیر ہے جو وہ استعمال کرے گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا بلکہ اپنے دائرے میں استاد کیا کر سکتا ہے؟ اس کے علاوہ میڈیا اور والدین کا بھی کردار ہے۔

معتزلہ اور اشاعرہ دو کلامی مکاتبِ فکر ہیں، اشاعرہ لفظوں کو دیکھتے تھے اور معتزلہ ریشنل بھی تھے، بعض لفظوں پر اعتراضات بھی کرتے تھے۔

ڈاکٹر حسن الامین

میرے مطابق ہمارے ہاں بارہ طبقاتی نظامِ تعلیم ہیں۔ بچے جزیروں میں پل رہے ہیں، یہ ریاست کی مجرمانہ غفلت ہے۔ صرف مادی چیزوں کی ترقی کو ترقی نہیں کہتے، معنوی عناصر کو بھی دیکھا جاتا ہے۔ جنوبی ایشیا میں انسانی ترقی کی اچھی مثال سری لنکا ہے، وہاں انکم بہت کم ہے لیکن انسانی ترقی بہت ہے۔ بلورستان، یہ گلگت میں علیحدگی کی تحریک تھی، اسی کی دہائی میں اس میں شدت رہی، اسی کے نتیجہ میں جوسٹیٹس بنا، یہ اس لیے بھی اہم ہے کہ جب لوگوں کو حقوق ملتے ہیں تو تحریکیں واپس ہوتی ہیں۔

نوبل پرائز آٹھ سو اکیاسی ہیں جن میں سے بارہ مسلمانوں کو ملے۔ عالم اسلام کا ایوارڈ شاہ فیصل بھی دیکھیں تو اس کی چار کیٹیگریز ہیں، سائنس میں ایک بھی مسلم کے پاس نہیں، اکانومی میں صرف ایک خورشید صاحب کو ملا، تو علم کی نمو میں ہمارا کیا حصہ ہے؟

انڈونیشیا کے دورے پر ہمارے کچھ دوست گئے وہاں تمام مذاہب کے تعارف پر مبنی ایک نصاب ہے جو تمام مدارس اور کالجز کے لیے ضروری ہے۔ اس طرح کے نصاب کی ہمارے ہاں بھی ضرورت ہے۔

تیسری نشست

عمومی رویوں میں عدم برداشت

خورشید ندیم

ہماری یہ نشست کوئی معلم اور متعلم کی حیثیت سے نہیں ہے، میری گزارشات کو آپ بحث کا آغاز سمجھیں، امید ہے کہ یہ نشست نتیجہ خیز ہوگی۔

سماجی رویہ کیسے بنتا ہے؟ یہ کسی شعوری کاوش کا نتیجہ نہیں ہوتا، ایسا نہیں ہوتا جیسے آپ لباس سیتے ہیں کہ دو جیبیں رکھنی ہیں وغیرہ، یہ غیر شعوری طور پر کچھ اثر انداز ہونے والے، اثر پذیری رکھنے والے عناصر سے تشکیل پاتا ہے۔ جس کا رویہ بن رہا ہے، وہ جب بن جاتا ہے تو پھر اندازہ ہوتا ہے کہ رویہ بن گیا ہے، یہ بڑی مبارک ساعت ہوتی ہے کہ جب کسی فرد کو یہ اندازہ ہو جائے۔

جب ہم بیمار ہوتے ہیں تو بخار خود کوئی بیماری نہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کوئی جسمانی عارضہ لاحق ہو گیا ہے، اس لیے بخار ایک نعمت بھی ہے، اسی طرح اگر کسی قوم کے ساتھ کوئی حادثہ ہو جائے اور وہ اسے متنبہ کر دے تو اس کا اس کی سماجی زندگی پر بہت اثر پڑتا ہے کہ میرے سماجی وجود کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آیا ہے جس کے علاج کی ضرورت ہے۔

پچھلی چار دہائیوں میں ہمیں یہ اندازہ ہوا کہ ہمیں کوئی عارضہ ہے جو دہشت گردی کے بخار کی صورت میں سامنے آیا ہے، ہم تشخیص کرتے ہیں، تین چار عشروں سے جو نتائج سامنے آئے ہیں اس سے یہ معلوم ہو گیا ہے کہ کوئی عارضہ لاحق ہو گیا ہے۔ دہشت گردی خود کوئی چیز نہیں، وہ انتہا پسندی کا اظہار ہے، کوئی گالیاں دے کر اظہار کر دیتا ہے، کوئی ہاتھ اٹھا کر اور کوئی دماغ استعمال کر کے جتھا بنا کر، یہی جب منظّم ہوتی ہے تو دہشت گردی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ آج ہم یہ سوچنے اور سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ یہ ہمارے ساتھ کیوں ہو گیا؟

ہمارے رویے میں عدم برداشت کا بڑا سبب سماجی اور تہذیبی روایت ہے جو نسل در نسل منتقل ہوئی ہے، سماجی عوامل جس میں ہم پرورش پاتے ہیں وہ ہم پر اثر انداز ہوتے ہیں، مثلاً ایک تصور غیرت ہے، یہ بڑی حد تک ایک صنف اساس تصور ہے ہم اسے نسوانی حیثیت میں مجسم دیکھتے ہیں، اس کے زیرِ اثر ہم انسانی جان لینے کو بھی روا سمجھتے ہیں، بلکہ اگر کسی نے غیرت کا مظاہرہ نہیں کیا تو معاشرہ اس پر دباؤ ڈالتا ہے کہ وہ بے غیرت ہے، جب تک قتل نہ کر لے اسے مرد نہیں سمجھا جاتا۔

اسی طرح گروہی عصبیت اور خاندانی عصبیت ہے، اس میں ہم اپنے گروہ کے بارے میں غیر شعوری طور پر عصبیت کا شکار ہوتے ہیں، وہ ہمیں ابھارتا ہے، ہماری عصبیت بیدار ہوتی ہے،

لڑائیاں بھی ہوتی ہیں کسی کی جان بھی لے لی جاتی ہے، یہی عدم برداشت ہے۔

ہمارا نسلی شعور ہمارے اندر عدم برداشت پیدا کرتا ہے، دوسری چیز ہمارا تاریخی شعور ہے، تاریخ کو ہم نے خاص تناظر میں دیکھا ہے، مثلاً ہم اپنی تاریخ کو 14 اگست 1947ء سے شروع کرتے ہیں، لیکن بعض اوقات جب ہم دوقومی نظریہ سمجھاتے ہیں تو محمد بن قاسم سے شروع کرتے ہیں، قائداعظم کے قول سے شروع کرتے ہیں، ہم کہتے ہیں کہ بھارت ہمارا دشمن ہے اور وہ ہمارے درپے رہتا ہے اس کے نتیجہ میں ہندو ہمارا دوست نہیں ہوسکتا، میں غلط یا صحیح کی بات نہیں کررہا۔ ہم ہندوؤں کے بارے میں ایک تصور کو قبول کرتے ہیں جس سے شخصیت کی اٹھان ہوتی ہے، اس سے بھی تشدد پیدا ہوتا ہے۔ ہمارے اجتماعی وجود میں تشدد پیدا ہونے کا دوسرا سبب تاریخی شعور ہے۔

تیسری چیز مذہب کا غالب تصور ہے، مذہب کیا ہے؟ بعض لوگوں کے ہاں مذہب تزکیہ نفس پیدا کرتا ہے، پیغمبر لوگوں کو یہ بتانے کے لیے آتے ہیں کہ ایک دن انہوں نے اللہ کے حضور پیش ہونا ہے، اگر میں کسی دائمی خسارے سے بچنا چاہتا ہوں تو اپنے وجود کو پاکیزہ بناؤں، انی لکم نذیر مبین، یہ ایک تصور مذہب یہ ہے۔۔

ایک تصور مذہب یہ ہے کہ مذہب میری عصبیت ہے، اور اس جذباتی عصبیت کی وجہ سے میں کسی کی جان بھی لے سکتا ہوں، مسلمان ہونا ایک عصبیت ہے، لہٰذا دنیا میں کسی بھی مسلمان کے ساتھ کوئی حادثہ ہوتو آپ کھڑے ہوجاتے ہیں جیسے راجپوت کے ساتھ ہوتو راجپوت کھڑے ہو جائیں۔ مذہب کا یہ تصور ہمارے ہاں غالب تصور ہے، یہ جملہ اکثر سنتے ہیں کہ مسلمان کتنا بھی گناہگار ہو لیکن اسلام کے خلاف کچھ برداشت نہیں کرسکتا، ایک آدمی کہتا ہے کہ آدمی جتنا بھی برا ہو، فریبی تو نہیں ہوسکتا، ان جملوں سے سمجھ آتا ہے کہ وہ مذہب کو کیا سمجھتا ہے، اس تعبیر کے نتیجہ میں ہمارے ہاں عدم برداشت پیدا ہوئی۔

ایک چیز اور ہے جس نے تشدد کو فروغ دیا ہے، وہ تصور انقلاب ہے جو پچھلے سو ڈیڑھ سو سال سے ہماری نفسیات میں سما گیا ہے۔ یہ کمیونزم سے آیا ہے کہ محرومیاں ایک خاص گروہ کی پیدا کردہ

ہیں، اس سے وسائل چھین لینا میرا حق ہے، غاصب قوتوں سے اپنا حق وصول کرنا ضروری ہے اور اس کے لیے خون بہانا پڑے گا، ماؤ نے اور لینن نے بھی لکھا کہ خون کے بغیر انقلاب آ ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا ہم نے اس انقلاب کے لیے ہر چیز کو جائز قرار دیا، شہادتوں کا سیکولر تصور بھی یہی سے رائج ہوا، یکم مئی کو جن مزدوروں کو شہدا کہا جاتا ہے، وہ کون تھے؟ اسی سے مسلمانوں سے بھی تصور انقلاب رائج ہوا، وہاں سے آپ نے سیکھا کہ دنیا میں انقلاب ایسے آتے ہیں، مذہبی لوگوں میں بھی یہ آیا تو انہوں نے اس کے دلائل مذہب سے تراشے۔ مسلمانوں نے اس سارے تصور کو اسلامیالیا۔ آپ مولانا مودودی اور ڈاکٹر اسرار صاحب کو پڑھیں تو آپ کو ملے گا کہ ایک وقت آتا ہے جب خون بہانا ناگزیر ہوجاتا ہے۔ اسی وجہ سے ہمارے تعلیمی اداروں میں تشدد کا عنصر اسی تصور انقلاب سے آیا۔

ایک چیز اور ہے جس سے ہمارا سماجی شعور وجود پذیر ہوا، وہ ہے ریاست کا بیانیہ ہے۔ اس کا پہلا مظہر جہاد کشمیر تھا، یہ 1997ء میں بہت پھیلا، مدارس جو کبھی اس کام میں نہیں پڑے تھے ان کو ریاست نے ابھارا، اس میں چالیس سال کے عرصہ میں پوری ایک نسل کا مزاج بنا دیا گیا، اس کے لیے دلیل دینا تحصیل لاحاصل ہے اس کے مظاہر ہمارے اردگرد پھیلے ہوئے ہیں۔

ایک اور فیکٹر عالمی سیاست ہے، ایک تصور یہ ہے کہ ایک نسل اٹھتی ہے اور وسائل پر قبضہ کرتی ہے اور غالب ہونے کی کوشش کرتی ہے، اس کے مقابلے میں کوئی قوم مغلوب بھی ہوتی ہے، اور مغلوب ہونے کے لیے کوئی بھی تیار نہیں ہوتا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد دو بڑی قوتیں بنیں، سوویت یونین اور امریکا، انہوں نے کوریا سے لے کر افغانستان تک جنگ لڑی، غلبے کی نفسیات سے اٹھی ہوئی جنگ۔ ہم بھی اس کا ہدف بنے، مغلوبیت ہمیں بھی پسند نہیں، ہمارے اندر اس کا ردعمل پیدا ہوا، اس کے خلاف لڑائی میں ایک اور چیز یہ پیدا ہوئی کہ ہم نے مغلوبیت سے بچنے کے لیے غالب ہونے کا تصور اپنا لیا۔ دنیا میں امت مسلمہ کا غلبہ کیسے ہو؟ کیا ہم ایک سامراج کو ہٹا کر دوسرا سامراج لانا چاہتے ہیں، ہم مسلم سامراج لانا چاہتے ہیں؟ اسی کے تحت ہمارے اندر تحریکیں

اٹھیں اسلام بمقابلہ کفر۔

ان سب عوامل نے مل کر میرے اور آپ کے سماجی رویے تشکیل کیے۔ یہ سب عوامل ہمارا انتخاب نہیں ہیں لیکن سب کا اثر ہوا، نتیجتاً ہم عدم برداشت کے مرض میں مبتلا ہو گئے۔ ہم پڑوسیوں کے مسائل تشدد سے حل کرتے ہیں، بچے کھیل پر لڑتے ہیں تو پہلا اصرار ہمارا یہ ہوتا ہے کہ ہمارا بچہ دوسرے کو مارے۔

ایک پی ایچ دی ڈاکٹر کے بچے کو دوکاندار نے مارا تو پہلا ردعمل اس ڈاکٹر کا یہ تھا کہ اس نے دوکاندار کو گریبان سے پکڑا۔ مسجد میں جھگڑا ہو گیا، اس کو بھی تشدد سے حل کیا جاتا ہے، اب سیاست میں بھی یہی ہوتا ہے، ہم نے چور ڈاکو ذلیل وغیرہ کے الفاظ بولنا شروع کر دیے، صرف سیاسی اختلاف کی وجہ سے۔ گجر خان میں جماعت اسلامی کے ایک دوست امیدوار تھے، ان کے مقابلے میں مسلم لیگ کے امیدوار تھے لیکن غیر جماعتی الیکشن تھے، دوسرے صاحب کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اسلام کے مقابلے میں کیا بیانیہ پیش کریں، تو انہوں نے کہا 27 فروری کے بعد یا میں رہوں گا یا اسلام رہے گا۔ مذہب کی بنیاد پر حق و باطل کا معرکہ قرار دیا جاتا ہے۔ ایک بہت بڑے عالم دین نے نظام مصطفیٰ کی تحریک میں شریک نہ ہونے والوں کو غزوہ تبوک سے پیچھے رہ جانے والے منافقین سے تشبیہ دی تھی۔ ماضی پر فیصلہ دینا آسان ہوتا ہے، آج کوئی کہہ سکتا ہے کہ 77ء کا انتخابی معرکہ کفر و اسلام کا تھا؟ آج سے دس پندرہ سال بعد جب ہم آج کی سیاست پر غور کریں گے تو ہمیں ایسا ہی نظر آئے گا۔

میرے نزدیک یہ چند اسباب ہیں جنہوں نے عدم برداشت پیدا کی، ہماری عدالتوں کے مقدمات میں زیادہ جائداد اور طلاق کے مقدمے ہیں۔ مزاجوں پر عدم برداشت کا غلبہ ہے، اسی وجہ سے سماجی یا مذہبی تنوع ہمارے لیے مصیبت بن گیا، اختلاف سے قومیں ترقی کرتی ہیں اور یہ ہمارے لیے دردسر بن گیا ہے۔ یہ وہ عوامل ہیں جن کا متبادل ہمیں معاشرے کو دینا ہے۔ مثلاً تاریخی شعور یا سماجی روایت کو کیسے نظر ثانی کی جا سکتی ہے؟ گروہی یا مذہبی عصبیت کو کیسے قابو میں لایا جا سکتا ہے؟ یہ

آپ جیسے لوگ جو سوسائٹی میں معاشرہ سازی کا کام کرتے ہیں زیادہ بہتر طریقے سے انجام دے سکتے ہیں، سماج پر زیادہ اثر انداز ہونے والے عناصر، مسجد، مدرسہ سکول، والدین ہیں، ہر آدمی والدین کی عزت کرتا ہے کہ اپنے والدین کو بھی ایسے ہی دیکھتے ہیں۔ یہ ساری چیزیں روایت میں آگے بڑھی ہیں، ہم نے معاشرے کو تبدیلی کا مرکز بنانے کی بجائے ریاست کو بنا لیا۔ ہر کام حکومت کو کرنا چاہیے، معاشرتی اداروں کو بہتر بنانے کی کرنے کی ضرورت تھی جو ہم نہیں کر رہے۔

محمد عامر رانا

بہت شکریہ، آپ کی گفتگو کا محور رہا کہ غلبے کی نفسیات میں مذہب اور انقلاب کا تصور، تبدیلی کا معیار ریاست کو بنایا جائے یا معاشرے کو۔ اب حاضرین جو استفسار کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔

سوال: دنیا میں جتنی بھی ترقی ہے اس کے لیے عزم و ہمت کی ضرورت ہوتی ہے، جب تک خاص حد تک رہے تو ٹھیک لیکن حد سے بڑھ جائے تو شدت پسندی پیدا ہوتی ہے، خورشید صاحب کی باتیں بڑی خوبصورت ہیں، کیا ہمیں اسلام ان پر قابو پانے کے لیے کوئی لائحہ عمل دیتا ہے؟

سوال: تصور انقلاب کے ساتھ تضاد کی ضرورت ہوتی ہے، ہم اس تصور کو مذہب سے کیسے الگ کر سکتے ہیں؟

جواب: ان تبصروں سے عدم اتفاق کی کوئی وجہ نہیں، سوالات کا جواب دینے کی کوشش کروں گا۔ دو چیزیں ہیں جس میں انسان کو کنٹرول رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے، مسرت اور غمی، سپورٹس یہ سکھاتی ہے کہ ہار کو بھی فیس کرنا ہے اور جیت کو بھی، یہ بھی تہذیب نفس کے لیے ہے۔ اصل چیز جو مطلوب ہے وہ ہے اعتدال، یہی بیلنس پیدا کرنا ہماری آزمائش ہے۔

اسلام لائحہ عمل دیتا ہے؟ یقیناً دیتا ہے، عمار صاحب جیسے اساتذہ بیٹھے ہیں، دنیا میں دو ہی طریقے رہے ہیں، ایک ہے الہام سے آپ فائدہ اٹھائیں یا فلسفی یا مفکر کے تجربات سے فائدہ اٹھایا جائے۔ قرآن مجید نے تین جگہ اس کو بیان کیا کہ وہ چاہتا تو سب کو ایک مذہب پر پیدا کرتا،

لیکن اس کا مقصد آزمائش ہے۔قرآن نے آٹھ مصارف زکوٰۃ بتائے، کسی میں بھی مذہب نہیں بتایا، پڑوسی کے ساتھ سلوک مذہب کی کسی تفریق کے بغیر بتایا۔

جب مسلمانوں کا اقتدار شروع ہوا تو ایک نظام کی ضرورت پیش آئی جس سے فقہی روایت پیدا ہوئی جس سے قانون دان پیدا ہوئے لیکن دین کی اصل روح کمزور ہونے لگی، پھر صوفیا پیدا ہوئے۔میرے نزدیک مذہب عصبیت کا نہیں تزکیہ نفس کا نام ہے۔

تاریخی شعور، برصغیر کے مسلمانوں کو مسئلہ درپیش ہوا، پہلے آپ نے قوت کی بنیاد پر حکومت کی، حل کے لیے تین چار تجاویز سامنے آئیں، الگ ملک بنایا جائے، یہ تصادم سے بچنے کے لیے مختلف حل سامنے آئے، اقبال نے کہا ہمارا مسئلہ مذہبی نہیں سماجی ہے، ہندو طبقاتی تقسیم کے قائل ہیں۔خطبہ آلہ باد میں کہا کہ وہ خود ایک قوم نہیں بن سکے تو ہمیں کیسے مانیں گے؟ ہمارے ساتھ اہل کتاب ہوتے تو پھر کوئی مسئلہ نہیں تھا۔قائد نے بھی کہا تھا کہ میری خواہش ہے کہ پاک و ہند کا تعلق امریکا و کینیڈا جیسا ہو۔حل جو پیش کیے گئے یہ تصادم سے بچنے کے لیے تھے نہ کہ تصادم پیدا کرنے کے لیے۔

ہمارے لیڈرز کی گفتگو کی بات ہوئی، سماج کا لیڈر صرف سیاستدان نہیں ہوتا، استاد، عالم اور والد بھی سماج کا لیڈر ہوتا ہے۔کچھ عرصہ پہلے نوابزادہ نصراللہ جیسے لوگ بھی تھے جو اختلاف اور تنقید کرتے ہوئے بھی فلاں صاحب کہتے تھے۔مولانا ابوالحسن علی ندوی کی قادیانیت کے رد پر ایک کتاب ہے، پوری کتاب میں جہاں بھی انہوں نے نام لیا قادیانی صاحب کہا، حالانکہ کتاب میں وہ جھوٹا نبی ثابت کررہے ہیں، لیکن کہیں بھی کذاب نہیں کہا۔

تصور انقلاب کی بات کریں تو میری فہم کے مطابق اسلام میں کوئی انقلاب کا تصور نہیں ہے، ارتقا کا تصور ہے، وہ رفتہ رفتہ تبدیلی کی بات کرتا ہے، اسلام ارتقائی عمل کو زیادہ فطری سمجھتا ہے۔ہم تقریر ختم کرتے ہیں وماعلینا الا البلاغ، ابلاغ ہماری ذمہ داری ہے۔آج کے دور میں میڈیا کو ہمارے روایتی لوگ بھی استعمال کررہے ہیں، اگر علما، سیاستدان درست ہوجائیں تو یہ ڈبہ بھی

درست ہوجائے۔

سوال: انقلاب بھی ہمارے سماجی رویوں میں کردار ادا کرتا ہے، وہ رویہ مذہب اور میڈیا کی بنیاد پر بھی تو ہورہا ہے، آپ کس عنصر کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں؟ اور حل کیا پیش کرتے ہیں؟

خورشید ندیم

میڈیا ایک کمرشل ادارہ ہے، وہ نفع کمانے کے لیے ہے، جب کوئی چیز تجارتی ہوجاتی ہے تو اس میں نفع ونقصان ہی دیکھا جاتا ہے، پیپسی کو پاکستان میں دل دل پاکستان نظر آتا ہے تو انڈیا میں اسے صارفین ڈھونڈنے کے لیے وہاں کے مطابق کوئی گانا بنالیتے ہیں۔تاریخ کا صحیح ماخذ کیا ہے؟ ایک ہے فلسفہ تاریخ اور ایک ہے وقائع نگاری۔سماج کے اندر جب واقعات ہوتے ہیں تو دیکھنا چاہیے وہ کس سیاق میں ہورہے ہیں؟ ابنِ خلدون کا مقدمہ بڑے اچھے انداز میں یہ بتاتا ہے۔تاریخ کو ہمیشہ فلسفہ تاریخ کی روشنی میں دیکھنا چاہیے اور اسے یک طرفہ نہیں دیکھنا چاہیے، جتنے ورژن پائے جاتے ہیں ان تک رسائی کرنی چاہیے۔مشہور ہے کہ عباسیوں نے تاریخ لکھوائی اور بنوامیہ کے خلاف لکھا گیا۔تاریخ کے بارے میں کوئی حتمی بات نہیں کہنی چاہیے، تاریخ مستند ذریعہ نہیں ہوسکتی۔

میں نے انقلاب نہیں، تصور انقلاب کی بات کی، جیسے خودی اور اقبال کا فلسفہ خودی الگ الگ چیزیں ہیں۔میں اس سیاق میں کہہ رہا ہوں کہ انقلاب کا مطلب ہے قلب ماہیت، شکل بدل جانا، انقلاب کے جو علمبردار ہیں کہتے ہیں کہ خون بہانا ناگزیر ہے، اس سے گھبرانا نہیں چاہیے۔سب انقلابی تحریکیں پرتشدد ہیں۔

میرے نزدیک کمیونزم اور مسلمانوں کے تصور انقلاب میں کوئی فرق نہیں سوائے بیانیہ کے۔ مودودی صاحب کی کتاب انقلاب کیسے آتا ہے میں سات مراحل بیان کیے گئے ہیں۔ڈاکٹر اسرار نے آٹھ مراحل بیان کیے اور لکھا کہ مسلح جدوجہد ضروری ہے۔ جہاد بالکل مختلف چیز ہے، اس کو سیکولر بھی جائز سمجھتے ہیں اور مذہبی بھی، ہر ریاست اپنے دفاع کا حق رکھتی ہے، جہاد کا تصور انقلاب

سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

سماجی شعور کی تربیت کیسے ہوتی ہے؟ PIPS اس طرح کے مذاکرے علما کے ساتھ بھی کرتی ہے اور اساتذہ کے ساتھ بھی۔ جن کی وجہ سے رجحانات سوسائٹی میں پھیلتے ہیں، آپ کے ہاتھوں میں ہے قوموں کی تقدیر، اگر آپ ٹھیک طرح سوچیں گے تو وہ تصور اسی طرح ضرب کھاتا چلا جاتا ہے۔ میرے خیال میں انبیا کی شخصیات سب سے اچھا ذریعہ ہیں، آپ مذہبی آدمی نہیں ہیں تو بھی انبیا کی زندگی سے آپ کو بہت کچھ ملے گا۔ ہمیں شکایت سامراجی معاشروں سے ہے، سویٹزرلینڈ سے ہمیں کوئی شکایت نہیں ہے، امریکا سے ہے، جب وہ سامراجی طاقت بنتا ہے۔

محمد عامر رانا

اس بھرپور مکالمہ کے لیے بہت شکریہ۔ کوشش رہی کہ موضوع کی مختلف جہتیں ہمارے سامنے آئیں، آپ کچھ سیکھ پائے یا نہیں، ہم نے بہت سیکھا، رواداری ایک منفی لفظ ہے دنیا کی ڈکشنری میں، چھوٹی سی مثال ہے کہ ہمارے ہاں قوانین بہت زیادہ ہیں، انڈونیشیا کی مثال ہے جہاں قانون سازی بہت زیادہ ہوئی، عمان کی مثال بھی ہے جہاں تنوع کو نعمت قرار دیا گیا، فرقہ واریت پر دس سال سزا ہے، معاشرے نے خود کو تبدیل کیا قانون کے بغیر، اور تیسری مثال ہماری ہے جہاں قوانین تو ہیں پر عمل نہیں۔

تبدیلی وہ ہے جو اندر سے آتی ہے جیسا کہ انڈونیشیا میں آئی۔ اسی لیے عرصہ ہوا وہ ایک مسلم ماڈل ہے جس سے ہر قوم کا تعلق ہے، یہ معاشرے کی قدریں ہیں جو اسے محفوظ بناتی ہیں۔ یہ چند سوچنے کی باتیں ہیں جن پر ہمیں اور آپ کو غور کرنا ہے، آپ ان امور پر لکھیں اور ہمیں بھی شریک کرنا چاہیں تو تجزیات کے صفحات حاضر ہیں۔ آپ کے سامنے محفوظ اور ہم آہنگ پاکستان کے نسخے ہیں انہیں آپ ساتھ لے کر جائیں اور صفحہ نمبر 28 سے 30 تک ضرور پڑھیں۔

سماجی ہم آہنگی اور مذہبی رواداری میں اساتذہ کا کردار

نویں ایک روزہ تربیتی ورکشاپ

10 اگست 2017ء، اسلام آباد

پہلی نشست

میزبان: محمد عامر رانا

ڈائریکٹر، پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز

معلم: ○ پاکستان کا فکری چیلنج

ڈاکٹر خالد مسعود

سابق چیئرمین، اسلامی نظریاتی کونسل

دوسری نشست

میزبان: محمد عامر رانا

ڈائریکٹر، پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز

معلم: ○ تبدیلی کے عمل میں استاد کا کردار

عمار خان ناصر

مذہبی سکالر، الشریعہ اکیڈمی، گوجرانوالہ

تیسری نشست

میزبان: محمد عامر رانا

ڈائریکٹر، پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز

معلم: ○ عمومی رویّوں میں عدم برداشت کیوں؟

خورشید ندیم

کالم نگار، اینکر پرسن

پہلی نشست

محمد عامر رانا

آج کی بات چیت شروع کرنے سے پہلے مکالمے کے آداب دہرانا ضروری ہے، آپ سب اساتذہ کرام ہیں اور جانتے ہیں کہ مکالمہ یک طرفہ نہیں ہوتا، اس لیے آپ کا نقطۂ نظر بھی سامنے آنا چاہیے، اسی سے مکالمہ آگے بڑھے گا، آپ کے سوالات بھی سامنے آئیں گے، لیکن تحمل اور شائستگی کے ساتھ۔ دنیا کی کوئی بھی بات ایسی نہیں ہے جس کے لیے خون کو گرمانا پڑے اور ہاتھ کو لہرانا پڑے۔ اسی طرح کراس ٹاک کی بالکل بھی اجازت نہیں ہے۔

آپ کے سامنے محفوظ اور ہم آہنگ پاکستان کا خاکہ موجود ہے، ہم انہیں موضوعات پر فوکس کر رہے ہیں جو سماجی ہم آہنگی کے لیے معاون ثابت ہوں۔ یہ دستاویز بہت اہم ہے، اس کے پیچھے گیارہ سال کی کاوشیں ہیں، ایک مسلسل عمل کے نتیجے میں یہ خاکہ سامنے آیا، جب آپ جائیں گے تو یقیناً اس کو پڑھیں گے۔

ہماری خوش نصیبی ہے کہ اس وقت ہمارے درمیان ڈاکٹر خالد مسعود صاحب موجود ہیں۔ آپ کسی تعارف کے محتاج نہیں، دنیا بھر کے علمی وفکری حلقوں میں پاکستان کی توانا آواز ہیں۔ پاکستان کو اس وقت کن فکری چیلنجز کا سامنا ہے؟ یہی آپ کا موضوع ہے۔

پاکستان کا فکری چیلنج

ڈاکٹر خالد مسعود

موضوع جو مجھے سونپا گیا ہے وہ ہے فکری چیلنج۔ فکر اور چیلنج، ان دونوں لفظوں کو اردو میں اگر دیکھا جائے تو اردو میں فکر کو اچھا نہیں سمجھا جاتا اور یہ ہمارے ہاں منفی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اور چیلنج کے لیے تو اردو میں کوئی لفظ نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ چیلنج وہ لوگ مانتے ہیں جو

اپنے اندر کمی سمجھتے ہیں، اس لیے یہ لفظ ہمارے ہاں نہیں ہے۔ ڈکشنری میں اس کا مطلب جنگ سے پہلے للکار کرنا ہے۔ للکار سے جو یادیں وابستہ ہیں وہ بھی دلچسپ ہیں، اسلام میں جنگ سے پہلے دعوت ضروری ہوتی ہے۔ اب کہتے ہیں دعوت ضروری نہیں بس جنگ شروع کر دیں۔

اس سلسلہ میں جو باتیں میرے ذہن میں ہیں، وہ میں آپ کے سامنے رکھ دیتا ہوں۔ میرے خیال میں پاکستان میں ہمیں بہت پہلودار چیلنج تھے۔ پہلا چیلنج تشخص کا تھا، جب جدید دور آیا اور ہمیں حقِ خودارادیت ملا کہ ہم اپنے آپ کی تعریف کیسے کرتے ہیں، اس میں اہم چیز قومیت تھی، اس سے پہلے مذہب تھا، یورپ میں مذہب کی وجہ سے جنگوں سے وہ بہت تنگ تھے اور چاہتے تھے کہ اب مذہب کی بجائے قومیت کو بنیاد بنایا جائے۔ دو رجحان ہوئے، اکثریت نے ہندو مسلم اتحاد کو قبول کیا اور قومیت کا جدید تصور مان لیا، لیکن مسلم لیگ کے لیے یہ مشکل تھا کیونکہ اس میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جو کسی زمانے میں اہل اقتدار تھے اور سمجھتے تھے کہ ہم سے اقتدار چھن گیا ہے، یہی ہمارے مسائل کی وجہ ہے اور شناخت کی بنیاد مذہب بنی۔ پاکستان بننے کے بعد جس علاقے میں پاکستان بنا، وہاں مسلم لیگ مضبوط نہیں تھی، ضرورت تھی کہ مذہب کے ساتھ ساتھ زبان و کلچر پر بھی کام کیا جائے جو نہیں کیا گیا۔ تو مذہب کو تشخص کا معیار بنایا جائے یا قومیت کو؟ ایک چیلنج تو یہ ہے۔

اس کے بعد ہمارے مذہب اور ثقافت کی تعریف کیا متعین کی جائے؟ ثقافتیں قومی نہیں علاقائی ہیں۔ پھر یہ سوال کہ ہماری تاریخ 1947ء سے شروع ہوگی یا اس علاقے کی تاریخ سے؟ مذہب سے مراد محض عقائد ہیں یا فقہ بھی ہے جو مسلک اور فرقہ پر جا کر ختم ہوتا ہے؟ ہمارے اندر دوسرے مذاہب بھی ہیں، ان کا پاکستان کی تاریخ میں برابر کا حصہ ہے، ان کی وجہ سے ہمارا جغرافیہ قائم ہوا کیونکہ یہ تحریک اقلیت کی تحریک تھی، دوسری اقلیتوں نے بھی ہمارا ساتھ دیا، بعد میں ہم نے اس تصور کو بدلنے کی کوشش کی۔

تیسرا یہ کہ اس علاقے میں سیاسی طور پر بہت سے انتظامات کی ضرورت تھی، اس میں ہماری

کمزوری رہی اور آج بھی ہمارے بنیادی حکومتی انتظامی امور نہ ہونے کے برابر ہیں۔ یہ بنیادی مسئلے ہیں۔

ان بنیادی مسئلوں کی بجائے ہمارا فکری چیلنج مذہبی رہا، ہم ان علاقائی تقسیموں کو مذہبی طور پر حل کرنے کی کوشش کرتے رہے، ہم علما و مشائخ کو بلا کر مسئلہ حل کرنا چاہتے ہیں جو نہ ہو سکا اور اصل مسئلوں کی طرف توجہ نہ ہو سکی۔ پاکستان میں ہم نے صرف مسلم امہ کے طور پر سوچنے کی کوشش کی، خطے کے اور عالمی حوالے سے ہم نے نہیں سوچا۔

جدیدیت سے ہمارا تعلق نفرت کا تھا، کچھ نے جدیدیت کو مغربیت سمجھا۔ جدیدیت الگ چیز ہے، یورپ اور امریکہ تک اس کو سمجھنے میں لگے ہوئے ہیں۔ تنوع کا ایک مسئلہ ہے، تنوع کو تسلیم کر کے ہی آپ آگے چل سکتے ہیں۔ مسلمان ممالک سمجھتے ہیں کہ ایک ہی مذہب ہو اور پھر وہ فرقہ واریت کی طرف چلے جاتے ہیں۔ قومیت اور قومی ریاست کی حیثیت دنیا کی ٹیکنالوجی اور ٹریڈ کے بعد ختم ہو گئی ہے، عملی طور پر اہمیت نہیں رہی لیکن ہم ابھی تک الجھے ہوئے ہیں اور جمہوریت پر اتفاق نہیں کر سکے، یہ اصل چیلنج ہے۔

قانون کی حکمرانی کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ قانون ایک ہو۔ یہاں ایک نہیں کئی قانون ہیں جو بیک وقت کام کر رہے ہیں۔ ایک قانون ریاست کا، ایک غیر ریاستی، جرگے وغیرہ، تیسرا جو طاقت پکڑ چکا ہے وہ ہے فتویٰ کا قانون، اس کی طرف ہماری توجہ نہیں ہے۔

اب ہم آتے ہیں نظام تعلیم کی طرف۔ ہم نے اس پر کام نہیں کیا۔ ہمارے ہاں لگا بندھا تصور ہے، امتحان سے تعلیم کو جانچا جاتا ہے۔ اصل مقصد تعلیم کا ہے تعلّم، نیا علم بڑھانا۔ ہمارے ہاں یہ نہیں ہے۔ لوگوں کو اس قابل نہیں بنایا جاتا کہ وہ نیا علم تخلیق کر سکیں، اس کے لیے کچھ تو مہارتیں ہیں کہ سوچنا کیسے ہے؟ تحقیق کیسے کرنی ہے؟ نتائج کیسے اخذ کرنے ہیں؟ اس کی تربیت بہت کم ہے۔ دوسرا مسئلہ تعلم کا یہ ہے کہ مضمون کا تازہ ترین علم دیا جائے اور یہ کہ اس پر کون سے ادارے کام کر رہے ہیں، نصاب میں یہ ہونا چاہیے جو غیر تسلی بخش ہے۔

اب میں مختصراً چار علمی تحریکوں کا ذکر کروں گا جو پاکستان میں آئیں۔ ان کا تعلق جدیدیت سے ہے۔ پہلی تحریکیں اٹھارہویں صدی کی ہیں جو اصلاح کی تحریکیں تھیں۔ یہ جدیدیت کے دور سے پہلے کی ہیں لیکن اصلاح کا آغاز ہو رہا تھا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ آپ گذشتہ کا جائزہ لیں اور اصلاح کریں، دو کام تھے کہ معاشرتے میں بدعات کو ختم کر کے سنت کی طرف جایا جائے اور تعلیمی اداروں میں بھی صحیح روایت کو لایا جائے۔ اس میں تقلید کے خلاف بھی تحریکیں اٹھیں، لیکن ہوا یہ کہ جس وقت یہ اصلاح کی تحریکیں اٹھ رہی تھیں تو استعمار آ گیا اور اس کے ساتھ جنگ سب سے بڑی ترجیح بن گئی، اب اصلاح کا کام رک گیا۔

دارالاسلام کی تعریف یہ تھی کہ رعایا مسلمان ہوں اور ان کا سربراہ بھی مسلم ہو۔ نئی تعریف یہ ہو گئی کہ اسلامی ریاست، اللہ کی حاکمیت اور شریعت کی برتری ہو۔ انیسویں صدی میں علم کی تحریک اٹھی جو معتزلہ کے قریب ہے کہ عقل اور وحی میں کوئی تعارض نہیں، سرسید نے کہا عقل اور سائنس میں کوئی تعارض نہیں۔ انھوں نے بائبل پر کمنٹری لکھی اور اس مسئلہ کو حل کیا، کیونکہ اس میں یہ بہت زیادہ تھی کہ سائنس اور مذہب میں تضاد ہے، انہوں نے کہا کہ خرابی تعبیر میں ہے، علم الکلام قدیم ہو گئی ہے۔

ہمارے ہاں بھی فقہ کو یونانی علوم کے ذریعہ پڑھا گیا۔ مثلاً قرآن کو پڑھیں تو وہ نہ ہسٹری کی کتاب ہے نہ سائنس کی کہ مثلاً بادل کی بات ہو تو پوری تفصیل ہو، ایک قصہ سے دوسری بات نکل آتی ہے۔ بات کرنے کا یہ طریقہ یونان سے بہت مختلف تھا، ہم نے علم البلاغت یونان سے لیا، اور یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ قرآن بے ربط ہے، آج بڑی کوششیں ہو رہی ہیں کہ اسے ربط وار بنایا جائے، ہم یہ بھول گئے کہ قرآن کی بلاغت عربوں کے مطابق ہے۔ جو بلاغت ہم پڑھتے ہیں، جو ہماری روزمرہ میں ہے اور قرآن کی بلاغت میں فرق ہے، ہم ہر چیز کو کتاب کی بلاغت میں بدلنے کی کوشش کرتے ہیں۔

سرسید کا کہنا تھا کہ ہمارا مکالمے کا طریقہ جدید ہونا چاہیے، بات وہ قرآنی بلاغت کی کرتے

تھے کہ قران کی تعبیر کا ایک معنی قوانین فطرت کے منافی ہو تو ہم قرینہ سے دوسرا معنی لے سکتے ہیں، معجزات کے متعلق انہوں نے معلومات اکٹھی کیں، حضرت موسیٰ و فرعون کے واقعے کے حوالے سے تاریخی طور پر بتایا کہ مدوجزر کا طریقہ یہ ہے کہ پانی بالکل پیچھے ہو جاتا ہے۔ انہوں نے اپنے وقت کی سائنس کو معیار بنایا تھا جو بعد میں بدل گیا۔

علم الکلام میں اشعریوں کے ہاں ایک بات چلتی ہے ایٹم کی کہ ایک پارٹ ہے جو تقسیم نہیں ہوتا الجزا یتجزا، لیکن بیسویں صدی میں دوسری تھیوریز آئیں۔ اب ہمارا مسئلہ اضافیت کا ہے۔ ہمیں نئے علم الکلام کی ضرورت ہے جو ان مسائل کو حل کر سکے۔ اقبال نے اسی کی بات کی اور اجتہاد کی ضرورت پر زور دیا۔ لیکن یہ دم توڑ گئی۔

پھر سیاسی اسلام کی تحریک اٹھی جس کی ابتدا افغانی سے ہوتی ہے۔ پھر ایرانی انقلاب آیا، اسّی کی دہائی میں علوم کی اسلامی تشکیل کی بات چلی، اس کی بنیاد یہ تھی کہ سب علوم کی ایک ثقافتی بنیاد ہوتی ہے، ہم جب تک اسلامی تشکیل نہ کریں اس وقت تک کوئی کامیابی نہیں ہو سکتی، لیکن یہ سیاسی اسلام سے بہت وابستہ ہے۔ افغانی کہتے کہ باقی کام چھوڑ کر سب سے پہلے استعمار سے جان چھڑانی ہے۔ سرسید کا کہنا تھا کہ فی الحال اقتدار کو بھول جائیں اور علم کو ترجیح دیں۔

پھر دور مسلح تحریکوں کا آیا کہ اگر آپ نے سیاسی طور پر حالات کو تبدیل کرنا ہے تو تشدد اور جہاد کی ضرورت ہے، مکالمے سے تبدیلی ممکن نہیں۔ خطرناک یہ ہوا کہ اس وقت عالمی منظر نامہ قطبیت کا تھا، سیاسی اسلام نے سرمایہ داری کا ساتھ دیا اور اشتراکیت کو شکست دی۔ مسلمانوں کا تشخص اقلیتوں کا بنا، مغرب میں علوم کی اسلامی تشکیل، اسلامی یونیورسٹیاں اسی کے تحت بنیں لیکن ان کی اسلامی روایت میں جڑ نہیں تھی۔

اس وقت ہم جس دور سے گزر رہے ہیں اس میں یہ دونوں تحریکیں ناکام نہیں تو کمزور ضرور ہو چکی ہیں۔ ہماری علمی روایت بہت ٹھوس ہے، ہمارے مدرسوں اور یونیورسٹیوں میں ٹھوس طریقہ سے نہیں پڑھایا جاتا، اصول فقہ پڑھایا جاتا ہے، قرآن کی فقہی آیات الگ سے پڑھائی جاتی ہیں،

ان کو ایک ساتھ پڑھایا جائے کہ اختلافات کے اصول کیا ہیں اور وجہ کیا تھی؟ اس سے فرقہ واریت ختم ہوگی۔ اختلاف کو منفی طور پر بتایا جاتا ہے چنانچہ فرقہ واریت مضبوط ہوتی گئی، آج ہم ان کو اکٹھا نہیں کر پاتے، لیکن حج پر یہ اکٹھے ہو جاتے ہیں۔

میں یہاں اس کو ختم کرتا ہوں، چیلنج کا مقابلہ کرنے کی لیے ہمیں مہارت کی ضرورت ہے اور اس کے لیے ہمیں تعقل کی ضرورت ہے۔ اصل میں اختلاف اسلام میں بہت اہم پہلو ہے، ایک واقعہ کہ جب عباسی خلافت آئی تو منصور نے کہا ہمیں ایک فقہ نافذ کرنے کی ضرورت ہے، امام مالک نے سختی سے انکار کیا، کہ ''الموطا'' تدوین ہے مدینہ کے اجماع کی، صحابہ دوسرے علاقوں میں بھی گئے۔ اگر آپ ان کو نظر انداز کر دیں گے تو میں اس کے حق میں نہیں۔ تقلید اس اختلاف کو محفوظ کرنے کا طریقہ تھا۔ کیا ہم ان اختلافات سے اوپر جا سکتے ہیں؟ کیا ہم بین المسالک نئی فقہ بنا سکتے ہیں؟ یہی کچھ چیلنجز ہیں جن کا آج ہمیں سامنا ہے۔

محمد عامر رانا

ڈاکٹر صاحب نے بڑی خوبصورتی سے پاکستان کو درپیش چیلنجز کا احاطہ کیا ہے جن میں جدیدیت، تشخص اور تنوع کا چیلنج شامل ہیں، اب ہم سوالات کے دو دَور کریں گے، سوال اور تبصرہ کرتے وقت یہ ذہن میں رکھیے کہ اس گفتگو کو ریکارڈ کیا جا رہا ہے، احتیاط سے بات کیجیے۔

سوالات و تبصرے

تبصرہ: چاروں فقہ پر مصر میں کام ہوا ہے، جواد مغنیہ کی تصنیف تو پانچوں مذاہب کو شامل کیا گیا ہے، ہمارے ہاں بھی اگر ایسا ادارہ بنایا جائے۔ آپ نے سرسید کی بات کی، اگر ہم قرآن کو سرسید کی سائنس پر لینا چاہیں تو اصل مقصد سے ہٹ جائیں گے۔

تبصرہ: ڈاکٹر صاحب میں سب کچھ سننے کے باوجود زیادہ الجھا ہوا ہوں، میں یہ پوچھتا ہوں

کہ مغرب کو ہم دیکھتے ہیں اور یہاں بھی لوگ کہتے ہیں کہ مذہب کو ہمیں ایک طرف رکھ کر گزرنا ہو گا، اگر سیاسی اور معاشی شعبوں تک مذہب کی مداخلت کو بڑھایا تو اس سے مسائل بڑھیں گے۔

تبصرہ: اسلامی احیاء میرے مطالعے کا میدان ہے۔ جسے ہم یورپ کی ترقی کہتے ہیں وہ سرمایہ دارانہ نظام کی عملی دنیا ہے۔ یورپ کی ترقی کے پیچھے سرمایہ دارانہ نظام ہے، اس میں بینکاری کا نظام آ گیا، علما فتوے دیتے ہیں، یا تو بینکاری کو ختم کیا جائے کیونکہ سرمایہ داری کا آغاز بینکاری ہی سے ہوا تھا۔

سوال: کسی قوم کی تشکیل کن عناصر سے ہوتی ہے؟ کیا کسی قوم کی تشکیل کے لیے کسی نظریے کا موجود ہونا ضروری ہے؟ ہماری تاریخ میں دو قومی نظریہ ہے، پاکستان بن جانے کے بعد ہمارے پاس کوئی نظریہ موجود ہے جس پر ہم چل رہے ہوں؟ ہم مذہب کی تعبیرات اور سائنس کو ہم آہنگ نہیں کر پا رہے، کیا ایسا کرنا یا ہونا ضروری ہے؟ کیا نبیؐ کے زمانہ کے بعد خلفا کے زمانہ میں بھی ایک سے زیادہ تعبیرات موجود تھیں؟ کون سی تعبیر کو قوتِ نافذہ حاصل ہوئی؟

تبصرہ: بہت سی نئی چیزیں سننے کو ملی ہیں، ہم سب تعلیم سے وابستہ ہیں۔ کیا استاد کا ماضی کی طرح وہی کردار ہے؟ وہی قوت ہے؟ کیا محض اچھے کردار کی بدولت وہ طلبہ کے کردار میں مطلوبہ تبدیلی لا سکتا ہے؟ جدیدیت کی طرح بہت سی اصطلاحات کو یوں پیش کیا جاتا ہے کہ ہم ماضی سے کٹ جاتے ہیں۔ آج سے پہلے تعلیم میں مرکزیت طالب علم کی تھی، میں سمجھتا ہوں کہ طریقہ تدریس میں مرکزیت استاد کی ہونی چاہیے۔ ہمارے طریقہ تدریس میں مشق اور آموختہ ضروری ہے۔

جوابات

بدقسمتی سے مغرب کی مخالفت بہت ہے، فلسفہ کی تاریخ نہیں پڑھائی جاتی، ارسطو اور افلاطون ملحد نہیں تھے، یورپ نے جب جب ارسطو کی منطق کو رد کیا تب تب وہ نئے راستے پر نکلے، ایک طبقہ ایسا ہے جو کہتا ہے ہمارا کوئی تعلق یورپ کی قدیم تاریخ سے نہیں ہے، ایک وہ ہے جو نقاد ہے۔ ارسطو

کی 'ٹیبل آف ٹروتھ' اب بھی ہے، ہمارے ہاں یا چیز صحیح ہوتی ہے یا غلط، کالے اور سفید کے درمیان بہت سارے ایریاز کا انکار کرنا پڑتا ہے۔ ہماری کتابیں علما نے انیسویں صدی کے شروع میں لکھیں تو علم کلام قدیم ہی رہا۔

چاروں مذاہب کی فقہ پر بہت سا کام ہوا، جواد مغنیہ نے پانچ فقہوں کو لیا، وھبہ الزحیلی نے بھی کام کیا، ہم اصول دیتے ہیں لیکن استدلال کی تفصیل نہیں دے سکتے، اگر آپ ''ہدایہ'' پڑھا رہے تو استدلال نہیں ہے، ''مبسوط'' میں استدلال کا ذکر بھی ہے، اگر نصاب میں شامل نہیں کر سکتے تو کم از کم استاد تو پڑھ کر آئے۔

سرسید کی سائنس کی بنیاد پر تفسیر، سرسید کے اپنے اصولوں کے لیے بھی وہ کافی نہیں تھی۔ نیوٹن کی سائنس کا عروج تھا، مولانا نانوتوی کے فتویٰ کی بنیاد یہ تھی کہ اجماع سے اختلاف کر رہے ہیں۔ سائنس پر عربی میں بھی کتابیں لکھی گئیں، رسالہ حمیدیہ، سرسید کا کہنا یہ تھا کہ سائنس میں تضاد نہیں ہے، قرآن اس کے خلاف نہیں ہے، قرآن کی تعبیریں بدل سکتی ہیں۔

مغرب کی نشاۃ ثانیہ کی بنیاد مذہب سے علیحدگی پر ہے۔ لیکن ہماری مذہب کی تعبیر ایسی نہیں ہے کہ جس پر کوئی اتھارٹی بیٹھے کہ اس کے خلاف آپ نہیں جا سکتے، اس لیے ہمارے ہاں اس پر زور نہیں دیا گیا، الجبرا میں فارابی اور ابن سینا نے اختلاف کیا، لیکن انہیں سزائیں نہیں دی گئیں، مغرب میں سزائیں بھی ہوئیں۔ فقہ میں پانچ یا چھ جرائم پر حدود ہیں اس کے علاوہ تعزیرات ہیں کہ ریاست طے کرے۔ اسی طرح بدعت کا تصور ہے، بدعت صرف اس چیز کو کہتے ہیں جو مذہب میں مذہب سمجھ کر کی جائیں، اس کا مطلب ہے کہ انہوں نے مذہب کی حدود اور دائرہ کار قائم کیا۔

خلافت کے تصور اور امامت کے تصور سے متعلق ماوردی نے کہا خلیفہ چار طریقوں سے ہوتا ہے، پھر ملوکیت آ گئی، اخیر میں یہ ہے کہ فوج بغاوت کر کے خلیفہ کو قابو کر لے۔ رسول اللہؐ نے امت پر چھوڑ دیا جو بھی طریقہ اختیار کر لے، یہی سیکولر کا یہ معنی ہے، اگر سیکولر کا معنی ملحد یا بے دین لیں تو پھر گنجائش نہیں۔

جدید دور سرمایہ داری کا ہے، اس پر اردو میں کوئی اچھی کتاب نہیں ہے۔ کیپٹل، داس کیپٹل سے بہت آگے نکل گیا ہے۔

طرز تدریس بدلا جانا چاہیے۔ پہلے زمانے میں نصاب کی بنیادی کتابیں پندرہ یا بیس ہوتی تھیں، اب استاد تدریسی سرگرمی کا مرکز نہیں ہے۔ ٹیکنالوجی نے مرکزیت بدل دی ہے۔ ہم کہتے ہیں بچوں کو ہم نے سیدھا کرنا ہے، جب کر نہیں پاتے تو خود سیدھے ہو جاتے ہیں۔ شاگرد اور استاد میں فرق ختم ہو گیا ہے، یونیورسٹی کی سطح پر شاگرد استاد کے لیے ذریعۂ آگاہی بن گئے ہیں۔

سوال: مذہبی انتہا پسندی کا ایک سبب فتویٰ بھی ہے، فتوی کا کوئی ایک مرکز نہیں بنایا جا سکتا؟

جواب: 1973ء کا قانون کثرت رائے سے بنا ہوا ہے، اس کے بعد اب یہ بحث ختم ہو جانی چاہیے تھی۔ اختلافات اس وجہ سے نہیں ہیں کہ انہیں ختم کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ سیاسی عمل میں مذہبی جماعتوں میں اکثر پارٹیاں عوام کی اکثریت حاصل نہیں کر سکتیں لیکن جوڑ توڑ میں ان کا اثر زیادہ ہے۔

کہا گیا کہ فتویٰ کا مرکز ہونا چاہیے، ریاست مرکز معاشرے کی ایک فکر آئی ہے جس میں کنٹرول ریاست کے پاس رہنا چاہیے۔ لیکن، علما اپنا ضابطہ بھی بنائیں اور ریاست اپنا کہ کون مفتی ہونا چاہیے۔ تاہم علما کو بجا طور پر یہ خدشہ ہے کہ اس طرح ریاست عثمانیوں کی طرح فتویٰ کے ادارے کو اپنے حق میں استعمال کرے گی اور دارالافتاء کی خودمختاری برقرار نہیں رہ سکے گی۔

جب پاکستان بن رہا تھا تو ان مذہبی جماعتوں کے لوگوں کو یقین نہیں تھا کہ یہ اسلام کے بارے میں مخلص بھی ہیں یا نہیں، پاکستان بننے کے بعد ان کا بیانیہ طاقتور بن گیا کہ پاکستان اس مقصد کے لیے بنا تھا، یہ لوگ اس وقت ساتھ نہیں تھے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت مسلم لیگ کی قیادت کا یہ بیانیہ نہیں تھا یا ان کو شک تھا۔

دوسری نشست

تبدیلی کے عمل میں استاد کا کردار

عمار خان ناصر

میں ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے اس اہم مسئلے پر گفتگو کا موقع فراہم کیا، اس پر میں اپنی طالب علمانہ معروضات پیش کروں گا۔ کسی معاشرے کے لیے داخلی ہم آہنگی اور رواداری کی اہمیت کئی پہلو سے ہے۔ داخلی استحکام اور امن امیج بنانے میں بہت اہم ہوتا ہے، اگر ہم سیرت سے رہنمائی لینا چاہیں تو آپؐ اس معاملے میں غیر معمولی حساسیت رکھتے تھے۔ یہ بات آپ کو بہت ناپسند تھی کہ مسلمانوں کا داخلی تنازعہ ان کا امیج بنے، معروف ہے کہ آپؐ نے ایک موقع پر بڑی شر پسند شخصیت رئیس المنافقین، جس کی اذیت اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ آپ نے فرمایا کہ کون ہے جو اسے روکے؟ لیکن جب بھی اسے قتل کرنے کا پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ دنیا کو یہ پیغام نہیں جانا چاہیے کہ محمد اپنے ساتھیوں کو مارتا ہے۔ امیج بنانے کی اہمیت اس سے معلوم ہوتی ہے۔

اسلامی تہذیب نے جو بھی علوم وفنون دیے اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس نے دوسری تہذیبوں کے لیے بھی گنجائش پیدا کی، کوئی بھی تہذیب ترقی کرنا چاہے تو اس کی شرط اول ہے کہ وہ سب کو شریک کرے، امتیازی سلوک نہ کرے، معاشروں کی پہچان اور شناخت کے لیے داخلی استحکام اہم ہے۔

ہمارے معاشرے کو جو سوال درپیش ہے، تاریخ کے عمل میں آنے والی کچھ بڑی تبدیلیوں کی وجہ سے مسلمان معاشرے توڑ پھوڑ کا شکار ہوئے، ہماری معاشرت ٹوٹی، نئی قوتیں ہمارے معاشرے پر اثر انداز ہونا شروع ہوئیں۔ ہم کافی حد تک پرانے سانچے سے باہر نکل آئے ہیں لیکن کسی نئے سانچے میں داخل نہیں ہوئے، ٹرانزیکشن کے عمل سے گزر رہے ہیں۔ یہ سوال کہ ہم کتنا مذہب کو تشکیل معاشرہ میں برقرار رکھیں، اس ضمن میں کلاسیکی خلافت کا تصور تھا یعنی مسلمانوں کی سیاسی وحدت۔ یہ جدید دور میں قومی ریاست میں تبدیل ہوا، بطور مسلمان ہماری وابستگی اور

شناخت بطور اسلام کتنی ہو اور جو نئی عالمی برادری بن رہی ہے جو مذہب کی بنیاد پر نہیں ہے اس میں ہم کیسے شامل ہوں؟ یہ بڑے سوالات ہیں۔

سوالات اتنے بڑے ہیں کہ ان پر ریاست کی سطح پر بات ہونی چاہیے اور سمت متعین کرنی چاہیے، یہ بات افراد کی سطح کی نہیں ہے، چنانچہ اس طرح کے تمام سوالات کی تان اسی پر ٹوٹتی ہے کہ ریاست کو کرنا چاہیے، میں اس بات کو مانتا ہوں بلکہ میرا خیال ہے کہ یہ ریاست سے بھی اوپر کا معاملہ ہے، بہت بڑی، تہذیب اور انسانی فکر کی سطح پر یہ سوالات چلے گئے ہیں۔

اس کے ساتھ ہم یہ دیکھیں، کہ جب اتنی پیچیدہ صورتحال پر جب ہم استاد کی بات کرتے ہیں اور موازنہ کرتے ہیں کہ ماضی میں وہ تربیت کا مرکز ہوتا تھا، علم کا معیار تھا، اس کے ساتھ بطور واقعہ یہ بھی جانتے ہیں کہ آج کے استاد کو اس سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ جدید تعلیمی نظام میں اسے ایک کارندہ سمجھا جاتا ہے جیسا دوسری صنعتوں میں ہوتا ہے، بنا بنایا نصاب اسے ملتا ہے، جتنے بڑے کردار کی توقع ہم استاد سے کر رہے ہیں، اس کے لیے اسے تیار نہیں کیا گیا۔

اب اس میں کیا کیا جائے؟ جس سطح پر ان سوالات کو حل ہونا چاہیے، جب تک تاریخ خود ایک سانچہ بنا دے ہمیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں اپنے معاشرے کی محدودیت کو بھی سمجھنا چاہیے، ہماری سیاسی حکومتیں ابھی بہت سی ذمہ داریوں کے لیے تیار نہیں ہیں اور انہیں وہ اختیارات ہی نہیں ہیں، پہلی جنگ انہیں اپنی بقا کی لڑنا ہوتی ہے، اس کے بعد اگر انہیں موقع ملے تو اگلے الیکشن کے لیے کارکردگی دکھا سکیں، معاشرے کے حوالے سے جو حکومت کی ذمہ داریاں بنتی ہیں یا یہ کہ خطے میں دوسرے ملکوں سے کیسے تعلقات رکھنے ہیں؟ اس تک جانے کا انہیں موقع نہیں ملتا یا جانے نہیں دیا جاتا۔ اس سے نکل کر ہی وہ معاشرے یا تعلیم پر کچھ سوچیں گے۔ یہ دو چیزیں (حکومت کی بقاء اور اگلے الیکشن کے لیے کارکردگی) اگر محفوظ ہو جائیں تو تب وہ معاشرہ سازی میں اپنے کردار پر سوچیں گے۔

اس طرح کی صورتحال میں چند طبقوں سے ہم توقع کر سکتے ہیں، ان میں سے ایک اساتذہ کا

طبقہ بھی ہے۔ اگر آپ کسی کے سامنے بیٹھے ہیں تو ایک احترام کا رویہ پیدا ہوگا۔ کل حسن الامین صاحب بات کر رہے تھے کہ اساتذہ 'لرننگ ایلیٹ' ہیں، جن طبقوں کی طرف نظر اٹھتی ہے ان میں بجا طور پر اساتذہ ہیں، اساتذہ غور کریں کہ ہم اپنے رویے میں کیا تبدیلیاں لا سکتے ہیں؟

میں دو تین چیزیں سامنے لا کر بات مکمل کروں گا۔ سماجی ہم آہنگی کا فقدان ہے اور رواداری کا، اس میں استاد کیا کر سکتا ہے؟ استاد کے منصب کی اخلاقیات میں پہلی چیز یہ ہے کہ معاشرے میں جو ماحول ہوتا ہے استاد بھی اس سے متاثر ہوتا ہے۔ استاد کے منصب کا تقاضا ہے کہ جب ہم کلاس روم میں آئیں تو ہمیں اس اخلاقیات کو سمجھنا چاہیے کہ یہ منصب ہماری ذاتی آرا کے لیے نہیں ہے۔ استاد مسئلہ کی مجموعی تفہیم تک خود کو محدود رکھے اور طالب علم کو اس قابل بنائے کہ وہ اس مسئلہ کو سمجھے۔ طلبہ چاہتے ہیں کہ استاد اپنا رجحان بتائے، اگر استاد اپنے رویے سے طلبہ کو یہ سمجھا دے کہ دوسرے نظریات کا بھی احترام کریں، صرف اس ایک اخلاقی اصول کو اگر ہم تعلیمی کلچر کا حصہ بنا دیں تو بہت بڑی تبدیلی آئے گی۔

ہم یہ کہتے ہیں کہ دینی تعلیم فرقہ وارانہ اصول پر دی جاتی ہے، یہ درست ہے۔ مسلکی شناخت کے ساتھ جب آپ عالم تیار کرتے ہیں تو یقینی طور پر اس کا معاشرے پر اثر پڑے گا لیکن وہ نظام کم سے کم دیانت دار ہے کہ یہ یہ ہمارے مسلمات ہیں، اگر ان پابندیوں کو آپ قبول نہیں کرتے تو یہاں سے جا سکتے ہیں۔

دوسری چیز جو ہم کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم نئی نسل کی فکری الجھنوں پر بات کریں۔ استاد طالب علموں کو صحافیانہ اثرات سے نکال سکیں۔ صحافتی سطحیت پر کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ انتہا پسندی پیدا کرنے میں ان کا کردار فرقہ وارانہ علما سے کم نہیں ہے۔ امید کو زندہ رکھنا اور مثبت مواقع کی طرف متوجہ کرنا استاد اور میڈیا کی ذمہ داری ہے، ایسا نہیں ہوتا کہ بہتری کے امکانات نہ ہوں اور ہر طرف شر ہی شر ہو، مایوسی نہ پھیلائیں، بھڑاس نہ نکالیں، شکایاتی لہجہ نہ اختیار کریں۔

ہر فرد اپنی جگہ پر مثبت کردار ادا کر سکتا ہے۔ امانت داری کی مثالیں آج کے دور کی دیں،

تاریخ سے اور صحابہ کے واقعات سے بھی مثالیں دی جاسکتی ہیں لیکن اپنے ماحول کی مثال کو زیادہ بیان کریں تاکہ وہ زیادہ اثر انداز ہو کہ میرے جیسے لوگ میری طرح کی مشکلات میں گھرے ہوئے لوگ اگر ایسا کر سکتے ہیں تو ہم کیوں نہیں؟

سوالات وتبصرے

تبصرہ: ہمارے عمومی تدریسی ماحول میں کیا استاد اپنا لیکچر تیار کر کے آتا ہے؟ علم کے لیے تحقیق ضروری ہے۔ استاد کو پاکستان میں احترام نہیں دیا جاتا، کہتے ہیں جو کچھ نہیں بن سکتا وہ استاد بن جاتا ہے۔ ہمارا سارا نظامِ تعلیم مخلوط ہو چکا ہے، اس پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

سوال: کہا گیا کہ درسگاہوں میں استاد کو ذاتی خیالات بیان نہیں کرنے چاہئیں۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم پرائیویٹ اداروں میں کر سکتے ہیں؟ جس کے پاس پیسے ہیں وہ جو بھی نظریات رکھتا ہو بیان کر سکتا ہے؟

سوال: عمار صاحب نے فرقہ واریت کی بات کی۔ کیا لیبل لگا کر تعلیم دینے سے ہم آہنگی ہو سکتی ہے؟ دیوبند اور علی گڑھ میں جو فاصلے تھے وہ کم ہوئے، کیا ان کو سب فرقوں کی معلومات دینے کی بجائے ایک نصاب پڑھانے سے ہم آہنگی ہو سکتی ہے؟

سوال: کیا ہم نے کوئی لائحہ عمل طے کیا ہے کہ مدارس کو قدیم وجدید سے نکالیں؟

تبصرہ: مدارس والے تبدیلی قبول نہیں کرتے، ان کے لیے جو بھی لائحہ عمل طے کیا جائے وہ اس پر عمل ہی نہیں کرتے۔

تبصرہ: جس شخص نے طائف کے واقعے کے بعد آپ کو پناہ دی تھی وہ مسلمان نہیں تھا، عربی زبان اور ادب پر بھی غیر مسلموں کا کام ہے، اس پر بات نہیں ہوتی۔

تبصرہ: استاد جب کلاس میں جاتا ہے تو اس کے بہت سے مسائل ہیں، امتحان کے مطابق مواد پڑھایا جاتا ہے، یہ نہیں کہ مواد کے مطابق امتحان لیا جائے۔

سوال: انسان کے جو بھی نظریات بنتے ہیں اس میں چار ادارے اہم کردار ادا کرتے ہیں، گھر کا ماحول، معاشرہ، میڈیا اور مذہب۔ کیا مسجد سے ہمارا تعلق ہے؟ کیا میڈیا انتہا پسندی نہیں پیدا کر رہا؟ ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ کیا یہاں صرف مذہبی انتہا پسندی ہے؟ کیا مذہب کے علاوہ کسی چیز میں رواداری لانے کی ضرورت نہیں؟

جوابات

میں نے یہ نہیں کہا کہ استاد کا کوئی کردار بنتا نہیں، یا وہ ادا نہیں کر رہا، میں نے کہا چیلنجز اتنے ہیں کہ استاد سے اتنی توقع نہ رکھی جائے۔ دوسری یہ کہ یقیناً تعلیم کے عمل میں استاد کی اہمیت ہے، یہ بات ٹھیک نہیں ہے کہ استاد کا احترام نہیں، احترام ہے لیکن اتنا ہی جتنا وہ معاشرے کو سکھا رہے ہیں۔ یہ منصب ایسا ہے کہ اپنی نوعیت میں احترام رکھتا ہے۔

استاد کو اگر کسی موضوع کی اہمیت کا اندازہ ہے وہ خود سے اس خلا کو پر کر کے اس پر لیکچر دے۔ مذہبی معاشرے میں مذہبی تعلیم قومی ضرورت ہے اور قومی ضرورت پورا کرنا ریاست کی ذمہ داری ہے، لیکن وہ اس کو ذمہ داری ہی نہیں سمجھ رہی۔

مدارس تبدیلی قبول نہیں کرتے یہ بات درست ہے لیکن وہ اسی معاشرے کا حصہ ہیں، پچھلے پندرہ بیس برسوں میں مدارس میں بھی تبدیلیاں آئی ہیں جیسے جیسے معاشرے میں آ رہی ہیں، مذہبی ادارے بھی وقت کے ساتھ اپنے آپ کو انہیں خطوط پر ڈھال لیں گے یا وقت ان کا متبادل لے آئے گا۔ مدارس کہتے ہیں ہم نے خاص دینی علم کو منتقل کرنے کے لیے اپنے آپ کو وقف کیا ہوا ہے۔ ہم روایتی علوم کے ماہرین پیدا کر رہے ہیں۔ مذہب نہیں مذہب پر مبنی رویے انتہا پسندی کا سبب بنتے ہیں۔

اساتذہ اور فکری مسائل اہم سوال ہے، استاد ان الجھنوں سے نمٹنے کے لیے خود تیار نہیں ہے۔ کسی بھی شعبے میں اساتذہ متعین پوزیشن سے جوابات لے کر رہنمائی کر رہے ہوتے ہیں۔ اساتذہ مسائل پر اپنے فہم کو گہرا کریں، جب آپ خود واضح مقام پر ہوں تو جواب دیں، جہاں

خود واضح نہیں وہاں بتائیں کہ میں بھی دیکھتا ہوں، آپ بھی دیکھیں۔

تیسری نشست

سماجی رویوں میں عدم برداشت کیوں؟

خورشید ندیم

ہمارا رشتہ کوئی معلم یا متعلم کا نہیں، یہ ایک مکالمہ ہے جس میں میں نے گفتگو کا آغاز کرنا ہے اس ضمن میں اپنے تجربات کا تبادلہ بھی آپ سے کروں گا۔ جو میں کہوں گا آپ اسے تنقیدی طور پر سنیے۔

سماجی رویوں میں عدم برداشت کیوں ہے؟ اس پر آج ہم سوچ بچار کریں گے، سماجی رویہ کسی شعوری کاوش کا نتیجہ نہیں ہوتا، بلکہ یہ کچھ عوامل ہیں جو فرد کی شخصیت پر اثر انداز ہو رہے ہوتے ہیں اور وہ ان کو قبول کر رہا ہوتا ہے، جیسے آپ مکان بناتے ہیں، اس کی ڈیزائننگ آپ شعوری طور پر کرتے ہیں لیکن رویہ ایسی شے نہیں ہے، بڑا ہی مبارک لمحہ ہوتا ہے کسی قوم کے لیے جب اسے احساس ہو جائے کہ جو رویہ اس نے اپنایا ہے اس میں کچھ خرابی آ گئی ہے۔ میں چونک اٹھتا ہوں کہ کہیں کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے، مجھے نظر ثانی کرنا اور سوچنا ہے، یہ احساس کسی علامت کے طور پر ظاہر ہوتا ہے کسی بخار کی طرح، بخار خود کوئی بیماری نہیں ہوتا لیکن ایک نعمت ہوتا ہے کہ آپ کو عارضہ کی خبر دے دیتا ہے۔ (باقی گفتگو آٹھویں ورکشاپ میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے)

سوالات اور تبصرے

سوال: قرآن میں غیر مسلموں کی جن الفاظ میں مذمت کی گئی ہے وہ بہت سخت ہے لیکن احادیث میں ایسا نہیں ہے، کہتے ہیں ان حالات میں تو اسلام حالت جنگ میں تھا، اب ایسا نہیں، حالانکہ قرآن کی ہر آیت قیامت تک کے لیے ہے۔

سوال: بات صرف عوامل کی نہیں، ان کو کنٹرول کرنے کی ہے، اساتذہ ہونے کی حیثیت سے

ہمارا کیا کردار ہو؟ سماجی پس منظر کی کیسے تشریح کی جائے، نسلی عصبیت کی بات بھی ایسی ہی ہے، نسل نہیں بدلی جا سکتی، اسی طرح مذہب کا معاملہ ہے، عدم برداشت سے کیسے نمٹنا ہے؟ ہماری رہنمائی فرمائیں۔

سوال: تصور انقلاب کی آپ نے بات کی، جب حقوق غصب ہوتے ہوں تو راستہ کیا ہے؟ دوسرا عامل عالمی حالات آپ نے بتایا، افغان جہاد کے کیا اثرات مرتب ہوئے؟ ہمارے پاس اس وقت ممکنہ حل اور کیا تھے؟

سوال: فرانسس نام کا ایک سیاح برصغیر میں آیا، اس نے کہا کہ یہاں کے لوگوں میں رشوت اور سفارش کا کلچر بہت ہے، اس بات کو تین سو سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے، کیا یہاں کا کلچر ہی یہی ہے؟ کیا جغرافیائی حالات بھی اثر انداز ہوتے ہیں؟

سوال: برداشت کیا ہے؟ رواداری اور برداشت کی حد کیا ہے؟ ایسا طالبعلم جس سے زیادتی ہو رہی ہے تو وہ کب تک برداشت کرے؟

سوال: ابن خلدون نے عصبیت کو مثبت انداز میں بیان کیا، آپ منفی معنی میں کیوں لیتے ہیں؟

تبصرہ: منڈیلا نے کسی عسکریت کی بات نہیں کی، تعلیم کی بات کی کہ اس سے بہتری لائی جا سکتی ہے۔

سوال: آپ نے رویوں میں عدم برداشت کا ایک عامل عالمی حالات بیان کیا اور کہا کہ غلبہ کسی کا نہیں ہونا چاہیے، تو پھر قرآن میں جو ہے لیظهره علی الدین کله اس کا مفہوم مجھے سمجھا دیں۔

جوابات

بہت خوشی ہوئی سوالات سن کر، یہ کہنا کہ قرآن اور سیرت میں تعارض نظر آتا ہے، یہ ہو نہیں سکتا، آپ کا منصب شارح کا ہے، یہ خلاف واقعہ ہے، قرآن میں کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس میں غیر مسلموں کی مذمت کی گئی ہو۔ قرآن کافروں کی مذمت کرتا ہے، جو حق سامنے آنے کے بعد

بھی سینہ تان کر کھڑے ہو جاتے۔ قرآن نے تو غیر مسلموں کی تعریف کی ہے، پاک دامن عورتیں اہل کتاب میں بھی ہوتی ہیں۔ اہل کتاب کی عورتوں سے شادی کے حکم میں ان کی یہ صفت بیان کی گئی ہے۔ جب جہاد کا پہلا حکم سورہ حج میں آیا تو فرمایا: **لولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لھدمت صوامع و بیع وصلوات ومساجد یذکر فیھا اسم اللہ کثیرا۔** قرآن نے جن کی مذمت کی یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے پیغمبروں کو گھروں سے نکالا، اذیت پہنچائی۔ جب مکہ میں لوگوں نے اسلام قبول کرنا شروع کیا تو کچھ لوگوں نے روکا۔ اس روکنے کی مذمت کی گئی، جن کے ساتھ ظلم ہوا ان کو لڑائی کی اجازت دی گئی **اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا**۔ قران میں حق کے مقابلے میں کھڑے ہونے والوں کے لیے وعید ہے۔ پیغمبروں کے ذریعہ اللہ لوگوں پر اتمام حجت کر دیتا ہے کہ اب ان میں خیر قبول کرنے کی صلاحیت نہیں، اتمام حجت سے پہلے یہ حق پیغمبر بھی نہیں رکھتا، حضرت یونسؑ کے واقعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے۔ اتمام حجت کے بعد اعلان ہوتا ہے کہ اب کوئی چارہ نہیں۔ قرآن نے لوگوں کے اس حق کو قبول کیا ہے کہ وہ مانیں یا انکار کریں، **لست علیھم بمصیطر، اما شاکرا واما کفورا۔** دنیا میں کسی کو غیر مسلم ہونے کی وجہ سے برا نہیں کہہ سکتے نہ زیادتی کر سکتے ہیں۔ یہ معاملہ یہود کے ساتھ نہیں ہوا، صرف مشرکین مکہ کے ساتھ ہوا، پورا فرد جرم اللہ نے بیان کیا کے اللہ کے مقابلے میں کھڑے ہو گئے تھے۔

اس میں شبہ نہیں کہ قرآن آخر تک قابلِ عمل ہے، لیکن بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو عہد رسالت کے ساتھ خاص تھیں، کچھ رسول اللہؐ کے ساتھ خاص تھیں۔

عوامل کا ذکر تو ہوا لیکن حل نہیں بتایا گیا، مختصراً یہ ہے کہ جو کام آپ کے کرنے کا ہے وہ آپ کریں، جو میں کر سکتا ہوں وہ میں کروں۔ حل کیا ہے؟ مجھے دعوت حل نظر آتا ہے، آپؐ نے مظلومانہ جدوجہد کی۔ آج کے دور میں جب جمہوریت آ چکی، لوگوں کی سوچ کو بدلا جائے، جو مظلومیت جاپان پر طاری ہوئی وہ شاید ہی کسی ملک پر ہو، لیکن جاپان امداد دینے والے ملکوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ تعمیری سوچ کی وجہ سے ہے۔ انقلاب ان معاشروں میں آتا ہے جہاں بات کہنے

کی آزادی نہیں ہوتی۔ کہا جاتا ہے کہ غالب قوتوں کی معیشت کی اساس علم پر استوار ہوتی ہے۔ جب تک علم میں امریکا کا غلبہ باقی ہے وہ برتر رہے گا۔

اس سوال پر کہ کشمیر اور جہاد افغانستان میں ہم کیا کرتے؟ چین نے ہانگ کانگ کیسے حاصل کیا؟ تائیوان بھی چین کا حصہ بن جائے گا، لیکن کبھی انہوں نے مسلح جنگ نہیں کی، قوموں کی بصیرت سے مسئلے حل ہوتے ہیں۔ ہمیں تسلیم کرنا چاہیے کہ ہمارے بڑوں نے بعض غلطیاں کیں۔

معاشرہ ارتقائی مراحل سے گزرتا ہے، پندرھویں صدی کا یورپ دیکھیں تو آج سے بہت مختلف تھا، یورپ میں اصلاح کا عمل آیا تو کسی مارٹن لوتھر کے آنے کے نتیجہ میں آیا۔

ہماری گفتگو کا کوئی نہ کوئی سیاق وسباق ہوتا ہے۔ اسی سے مفہوم طے ہوتا ہے۔ عدم برداشت کا لفظ بھی منفی معنی میں استعمال ہوتا ہے، انسانی رویوں میں عدم برداشت کی کوئی حد نہیں ہے، بوڑھے والدین کے سامنے اُف تک نہ کہیں، کوئی حق غصب ہو تو قانون سے مدد لی جاتی ہے، بعض اوقات میاں بیوی کے درمیان مسائل پیدا ہو جاتے ہیں، اس کی مختلف سطحیں ہوتی ہیں۔

میں عصبیت کو لغوی معنی میں لے رہا ہوں، میں جمہوریت کو بھی عصبیت کا مظہر کہتا ہوں، اسی عصبیت کے اصول کی بنیاد پر آپ نے فرمایا تھا: **الائمہ من القریش۔**

قرآن نے غلبہ دین کی بات جو کی یہ رسالت مآبؐ کا مقصد بعثت بیان کیا، ہمارا نہیں، دوسری آیت میں ہے **کتب اللہ لاغلبن انا ورسلی**، رسولوں نے غالب ہونا ہی ہے، **علی الدین کلہ** سے مراد جزیرہ عرب کے ادیان ہیں۔

کچھ چیزیں آپؐ کے عہد کے ساتھ خاص ہیں جیسا کہ مرتد کی سزا۔ آپؐ نے فرمایا مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لڑوں جب تک لوگ کلمہ نہ پڑھ لیں لیکن آج کلمہ نہ پڑھنے والوں سے ہم لڑتے نہیں، یہ ایک خاص عہد کے ساتھ ہے۔ یہودیوں سے دوستی کی جو ممانعت کی آیت ہے اس میں **من دون المومنین** کی قید ہے کہ مسلمانوں کو چھوڑ کر یہودیوں سے دوستی کریں۔ یہ شریعت کا دائمی حکم نہیں، اسلام تو اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کی اجازت بھی دیتا ہے، نکاح کی اجازت محبت

کے بغیر نہیں ہوسکتی، اس اجازت پر عمل کرتے ہوئے اگر آپ یہودی عورت سے شادی کرتے ہیں تو وہ آپ کے بچوں کی ماں ہے، کیا بچوں کو آپ اپنی ماں سے محبت کرنے سے روکیں گے؟

محمد عامر رانا

بڑا اچھا مکالمہ رہا، استاد کے کردار پر بات ہوئی، ہم نے کوشش کی کہ صرف بحث کا آغاز کیا جائے، آپ رابطے میں رہیں، لکھ کر تبادلۂ خیال کریں، ہم چاہیں گے کہ آپ اس بحث کو اپنی اپنی سطح پر جاری رکھیں۔

سماجی ہم آہنگی اور مذہبی رواداری میں اساتذہ کا کردار

دسویں ایک روزہ تربیتی ورکشاپ

7 ستمبر 2017ء، کراچی

پہلی نشست

میزبان: محمد عامر رانا

ڈائریکٹر، پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز

معلم: ○ پاکستان کا فکری چیلنج

ڈاکٹر خالد مسعود

سابق چیئرمین، اسلامی نظریاتی کونسل

○ نصاب یا طرزِ تدریس

سید احمد بنوری

مذہبی سکالر، جامعہ بنوریہ کراچی

دوسری نشست

معلم: ○ عمومی رویوں میں عدم برداشت

ڈاکٹر عبدالحمید نیّر

سابق پروفیسر، قائداعظم یونیورسٹی، اسلام آباد

○ سوشل میڈیا اور سماجی ہم آہنگی

سبوخ سید

صحافی و اینکر پرسن

تیسری نشست

معلم: ○ استاد برائے تعلیم

ڈاکٹر سید جعفر احمد

سابق ڈائریکٹر، پاکستان اسٹڈی سینٹر، کراچی یونیورسٹی

پہلی اور دوسری نشست

(مقررین کی گفتگو کے اہم نکات گذشتہ ورکشاپس کی کارروائیوں میں آچکے ہیں، تکرار کی بجائے سبوخ سید کی گفتگو کے بعد براہِ راست سوال و جواب کی نشست کی روداد پیش کی جارہی ہے)

سوشل میڈیا اور سماجی ہم آہنگی

سبوخ سید

مبشر صاحب بھی ٹی وی میں کام کرتے ہیں اور میں PTV میں، PTV کا ٹائٹل ہے کہ 'سچ ذمہ داری کے ساتھ'، میں تھوڑی سی سچ بات کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

بزرگوں نے بات کی کہ سوشل میڈیا کے ذریعے فرقہ واریت بہت زیادہ پھیل گئی ہے لیکن یہ کہنا مناسب نہیں ہوگا کیونکہ ہم اپنے بچپن میں دیکھا کرتے تھے جب لاؤڈ اسپیکر آیا تو لوگ کہتے تھے لاؤڈ اسپیکر کی وجہ سے بہت زیادہ گند ہوگیا ہے۔ حالانکہ لاؤڈ سپیکر سے بندہ بور ہوجاتا ہے۔ اسی طرح لاؤڈ اسپیکر جب نہیں تھا تو اس سے پہلے بھی چیزیں موجود تھیں۔ لاؤڈ اسپیکر کے بعد بھی موجود رہیں۔ پھر ٹی وی آگیا۔ جس طرح آبادی بڑھتی رہی چیزیں بھی بڑھتی رہیں۔ یہ فرقہ وارانہ جتنی بھی چیزیں ہیں، آپ دیکھتے ہیں کہ سوشل میڈیا پہ پیجز بنے ہوئے ہیں اور وہ علماء ذمہ داری کے ساتھ انھیں چلاتے ہیں۔ چھ چھ لاکھ ان کے فالورز ہیں۔ یوٹیوب پر چینل بنے ہوئے ہیں وہ بھی یہیں ہیں۔ آپ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ علماء کوئی کمزور ہیں بلکہ ان کے نام کے نعرے لگانے

والے گلی محلے چوک چوراہے میں ملتے ہیں، اس دفعہ جب آپ واپس جائیں گے تو آپ کو سڑک کے اردگرد چاکنگ ہوتی ہے، آپ کو معلوم ہوجائے گا کہ وہ وجود رکھتے ہیں یا نہیں رکھتے اور ان کی ٹھیک ٹھاک پیروی ہے، لوگ ان کو مانتے ہیں۔ پھر انہی کے ذریعے امن کی بات بھی کی جاتی ہے، امن کمیٹیوں میں ان کو بلایا جاتا ہے۔ مطلب یہاں یہ سارا کچھ ہورہا ہے۔ میں یہ بات کہنا چاہ رہا ہوں کہ ہمیں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ علماء ہیں، محرم الحرام میں ان علماء پہ فلاں ضلع میں داخلے پر پابندی ہے، وہ علماء ساری رات کسی ٹی وی پر بیٹھے ہوتے ہیں۔ یعنی اگر وہ ضلع میں چلے جاتے ہیں تو ہزار دو ہزار بندے سے ملتے جبکہ آپ نے ان کو ٹی وی پہ بٹھا کر لاکھوں لوگوں تک ان کی آواز پہنچاتے ہیں، یہ ایک ٹول ہے، اگر کوئی شخص کلاشنکوف میں گولیاں ڈال رہا ہے اور مار رہا ہے، آپ کلاشنکوف کو گالیاں نہیں دے سکتے بلکہ جو کلاشنکوف کو استعمال کررہا ہے اس کے بارے میں آپ کو غور کرنے کی ضرورت ہے۔ مبشر بھائی نے بات کی کہ ٹی وی چینل پہ ہمارے اینکر ویسے ہی پروگرام کرتے ہیں۔ ہمارے کچھ اینکر رمضان میں ٹی وی پہ مذہبی پروگرام کرتے ہیں۔ آپ مجھے بتائیں گے کہ کتنے اینکر ہیں جن کی مذہبی تعلیم ہے؟ مسئلہ یہ کہ ہم سارے مسائل پر بات کرتے ہیں، ہمارے علماء بھی بات کرتے ہیں لیکن اس مسئلے پر کیوں بات نہیں کرتے کہ ٹی وی پر موجود جو بندہ بحث و مباحثہ کروا رہا ہے خود اس کا دینی پس منظر کتنا ہے۔ اس کو علم ہی نہیں ہے، آپ نے خواہ مخواہ بٹھایا ہوا ہے۔ ہمارے کچھ اینکر ایسے ہیں جن کو صحافت کی تعلیم ہی نہیں ہے۔ کوئی میڈیکل کرکے آیا ہے کسی کی ڈگری جعلی ہے لیکن وہ پروگرام کرتے ہیں۔

پاکستان میں تقریباً 120 یونیورسٹیاں ابلاغِ عامہ کی ڈگری کروا رہی ہیں۔ ان کے سارے بچے مارکیٹ میں آرہے ہیں، یہ جو لوگ آگے بیٹھے ہوئے ہیں، جو ذرا سا اچھا بول لیتا ہے یا ماحول گرم کرسکتا ہے یا ریٹنگ اچھی لاسکتا ہے تو ان کو چینلوں نے اینکر بنا دیا ہے۔ اب تو سیاستدانوں کو بھی اینکر بنا دیا ہے۔ سارے وہاں بیٹھ گئے ہیں تو بہت سے مسائل ہیں جن پر کوئی بات نہیں کرتا۔ مسئلہ یہ کہ ان باتوں کو ہم اپنی بات سمجھتے ہی نہیں ہیں۔ ہم اپنے مسائل سے ہمیشہ فرار اختیار کرتے

ہیں لیکن جب اکٹھے بیٹھ جاتے ہیں تو ہمیں یاد آتا ہے کہ یہ مسئلہ بھی ہے یہ مسئلہ بھی ہے۔ بات یہ ہے کہ ہم ان باتوں کو سوشل میڈیا کے ذریعے اٹھا سکتے ہیں۔ ہم یہاں پر اگر پچاس ساٹھ افراد جمع ہیں، ہم میں سے ہر بندہ آج جا کر فیس بک پر سٹیٹس لکھے کہ یہ میڈیا پر تماشا ہو رہا ہے یہ کیا چل رہا ہے۔ دیکھیں ہر بندے کی فیس بک پر تقریباً پانچ ہزار لوگ ہوتے ہیں، اس کے آگے پھر کتنے لوگ ہوتے ہیں۔ یہ آپ آج رات میں اسی نوے ہزار لوگوں تک یہ پیغام پہنچا سکتے ہیں۔ لوگ آپ کو پڑھتے ہیں، آپ آواز اٹھائیں، کیوں نہیں اٹھاتے؟ آواز اٹھانے کے لیے آپ کو ''ڈان'' میں ''جیو'' میں جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ گھر بیٹھ کر آپ یہ آواز اٹھا سکتے ہیں کہ ہر چیز غلط ہو رہی ہے، یہ اس کا حل ہے کہ آواز تو اٹھانی چاہیے۔ آپ پیمرا میں بھی رپورٹ کریں لیکن عوام میں بھی یہ آواز ضرور اٹھانی چاہیے، اس سے یہ چیزیں بڑی حد تک بہتر ہو سکتی ہیں۔

ہمارے کئی بچے ایسے ہیں جو باقاعدہ سوشل میڈیا کے ذریعے دہشت گردی کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ آپ نے مذہبی ہم آہنگی کی بات کی تھی، آپ نے نورین کا قصہ دیکھا ہوگا۔ اس کے والد کالج میں استاد ہیں۔ ایک طالبہ سوشل میڈیا کے ذریعے متاثر ہوئی اور سوشل میڈیا پر جو لوگ اس کو اس طرف راغب کرنے والے ہیں، اس کا رجحان بنانے والے ہیں ان کو پتا ہے کہ بچی کو کس طرح اپنے راستے پر لانا ہے، وہ بچے کو یہ نہیں کہتے کہ آپ دوپٹہ اوڑھو یا داڑھی رکھ لو، اور اگر دوپٹہ نہیں پہنتی تو نہ پہنو اصل چیز مقصد ہے۔ وہ آپ کے گھر کے اندر ایک استاد بھی یہ محسوس نہیں کر سکا کہ اس کے بچے کے ساتھ اس کی بیٹی کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ طالب علم گھر میں موجود ہے، بچے کا ذہن بدلا ہے اس کو نہیں پتہ چلا۔ مسئلہ یہ ہے کہ اب یہ سب لوگوں کو مل کر دیکھنا ہے۔ اب آپ کو یہ کہہ نہیں سکتے کہ یہ ''ڈان'' پر کیا بتا رہا ہے یا ''جیو'' پر کوئی بتا رہا ہے، یہ تو آپ کے گھر میں چیز پڑی ہوئی ہے۔ مبشر بھائی بات کر رہے تھے کہ آپ فلٹر لگا سکتے ہیں، بچے اب بہت ہوشیار ہیں، وہ پروکسی لگا کر دیکھ لیتے ہیں۔ صورت حال بڑی خطرناک ہے، اس لیے اب والدین اور اساتذہ کو ایک قربت کا مزاج اپنانا ہوگا۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ یونیورسٹیوں کو چاہیے کہ سوشل میڈیا کے

حوالے سے کم از کم کوئی اشتہارات بنائے جائیں۔ اگر آپ نصاب جلدی نہیں بنا سکتے، ان میں لکھا جائے کہ سوشل میڈیا پہ آنے والی ہر بات سچی نہیں ہوتی، مصدقہ نہیں ہوتی۔ سوشل میڈیا پہ اکثر لوگ گمراہ کن خیالات کے ساتھ آتے ہیں اور دہشت گردی کی وجہ بنتے ہیں۔ اسی طرح آپ بہت سی باتیں اور لکھ سکتے ہیں۔ میرے خیال میں جب تک ہم اس کو ایسا نہیں کر سکیں گے چیزیں ایسی ہی رہیں گی۔

ایک سوال فرقہ وارانہ تقسیم کے حوالے سے تھا۔ ہمارے ملک میں جو فرقہ وارانہ تقسیم ہے اس کو تو ہماری حکومت بھی قبول کرتی ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل میں یہی فرقہ وارانہ بنیاد پر سیٹیں تقسیم ہوتی ہیں۔ وہاں تو ایسے ایسے لوگ نظریاتی کونسل میں بیٹھے ہیں، میں ان کے نام نہیں لیتا، ان کی کیا علمی سطح تھی، پھر وہ وقت بھی آیا جب وہ دست و گریباں ہوئے۔ صورت حال یہ ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل کو فرقہ وارانہ حد آپ نے لگا دی ہے۔

اسلام آباد میں ایک صاحب نے اجازت مانگی کہ میں ایک مسجد بنانا چاہتا ہوں جو کسی فرقے کی نہیں ہوگی۔ CDA نے کہا ہم اجازت نہیں دے سکتے۔ یعنی آپ کو لازماً کسی فرقہ کی تائید کرنی ہے۔ یہاں بھی علماء نہیں بولتے کہ آپ ہمیں فرقوں کی بنیاد پر کیوں تقسیم کرتے ہیں کیونکہ اصل میں ان کا فائدہ اسی فرقہ واریت میں ہے۔ سائبر کرائم کے حوالے سے بات کر دوں کہ حکومت وہ قانون سازی کر رہی ہے۔

سوالات اور تبصرے

1۔ میرا سوال یہ ہے کہ ایک عام آدمی جب چار پانچ چینل دیکھ لیتا ہے اور چند اخبار پڑھ لیتا ہے تو چیزیں اتنی مختلف ہونے کی وجہ سے اس کی رائے کیا بنتی ہوگی، کیا ہم لوگوں کو بند گلی کی طرف لے جا رہے ہیں؟

2۔ مبشر زیدی صاحب سے میرا سوال یہ ہے کہ ٹی وی چینل جو متنازعہ مواد دکھا رہے ہیں یا پرنٹ

میڈیا چھاپ رہا ہے اس میں قصور کس کا ہے؟ دیکھنے والے کا دکھانے والے کا یا پھر پڑھنے والے کا؟ کس کا قصور زیادہ ہے؟

3۔ سبوخ سید صاحب نے بتایا کہ سوشل میڈیا ایک پلیٹ فارم ہے، اس طرح الیکٹرانک میڈیا بھی ایک پلیٹ فارم ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ سوشل میڈیا پر تو ہر طرح کا پس منظر رکھنے والے لوگوں کی تعداد میں جب اضافہ ہوا تو سب کے سب اپنے اپنے بیانیے کے ساتھ آئے، لیکن مرکزی دھارے کے میڈیا میں جب صحافی یا اینکر پرسن کی تعداد میں اضافہ ہوا تو ظاہر ہے وہ بھی اپنے اپنے بیانیے کے ساتھ آئے۔ اس میں اس پلیٹ فارم کا اپنا کتنا حصہ ہے کہ وہ انہیں مائل کرتا ہے یا ان کی رائے پر اثر انداز ہوتا ہے؟

4۔ میرا خیال یہ ہے کہ ہمارے درمیان مذہبی منافرت یا فرقہ ورانہ اختلافات کو پھیلانے یا اُبھارنے میں اس وقت جتنا سوشل میڈیا کا کردار ہے اتنا کسی چیز کا نہیں ہے، اس لیے کہ وہ چیزیں جو صرف علمی حلقوں میں سمجھی سمجھائی جاتی تھیں، زیر بحث لائی جاتی تھیں، وہ علماء کے مابین مکالمہ تھا، اس کو میڈیا پہ لا کر ایک عام آدمی کے سامنے رکھ دیا گیا ہے جسے اپنے دین کی سمجھ بوجھ بھی نہیں ہے، وہ آدھی بات سن کر اس پر فتویٰ دینا شروع کر دیتا ہے۔ اس حوالے سے ایک اور چیز یہ ہے کہ جس وقت دو لوگ آپس میں بحث کرنے لگتے ہیں تو اگر ایک طرف کسی بھی مسلک کا مضبوط آدمی ہے دوسری طرف ہلکا آدمی ہے، گفتگو کرنا ایک فطری عمل ہے ہر آدمی اس طرح مدلل گفتگو نہیں کر سکتا جس طرح دوسرا۔ ہوسکتا ہے اس کے پاس علم ہو لیکن وہ بیان نہ کر سکے۔ ایسی کوئی حکمت عملی ہونی چاہئے کہ ایسی چیزوں سے بچا جائے تاکہ یہ مذہبی منافرت جو کم ہونے کے بجائے مزید بڑھتی جا رہی ہے، اس کی روک تھام ہو۔

5۔ میرا سوال سبوخ سید صاحب سے ہے کہ جو الیکٹرانک میڈیا ہے یا پرنٹ میڈیا ہے جس کے لیے کچھ قوانین موجود ہیں وہ فلاں چیز کو نشر نہیں کر سکتے ہیں یا کر سکتے ہیں لیکن سوشل میڈیا میں جو فیس بک ہے، ٹویٹر ہے، کیا حکومت پاکستان کی طرف سے اس کے لیے بھی کوئی اقدامات کیے

جا رہے ہیں؟

6۔ سوشل میڈیا پہ لوگ مختلف شر کا کولڑا کر یہ اینکر پرسن ملانے کی بات کرتے ہیں یا لڑانے کی بات کرتے ہیں؟

7۔ کوئی چینل اس وقت ہماری آنے والی نسلوں یا ہمارے بچوں کی تربیت کے حوالے سے کوئی خاص کردار ادا نہیں کر رہا۔ کیا یہ میڈیا کی ذمہ داریوں میں سے نہیں ہے؟

8۔ اب جبکہ میڈیا سے ہمارا فرار ممکن نہیں رہا تو کیوں نہ ہم اس کو قبول کر کے اس کے ساتھ چلنے کی کوشش کریں اس کا حصہ بنیں؟

جوابات

مبشر زیدی

الیکٹرانک میڈیا کا خمیر ہی اس منشور پر رکھا گیا ہے کہ جو ایڈیٹر اخبار میں ہوتا تھا وہ چینل میں نہ ہو۔ وہاں مالک ہی ایڈیٹر ہوگا، مالک ہی فیصلہ کرے گا، وہی اینکر کو کہے گا کہ آج تم نے فلاں پارٹی کو تنقید کا نشانہ بنانا ہے کیونکہ اس نے ہمیں اشتہار نہیں دیا۔ اسی وجہ سے آپ کو ہر چینل پہ ایک مختلف تناظر نظر آتا ہے اور یہ ہو بھی سکتا ہے۔ لیکن اتنے برسوں سے سن سن کر اتنا تجربہ ہو چکا ہے کہ میں خود نکال لیتا ہوں کہ اس میں سے اصلیت کتنی ہے اور زیبِ داستان کتنا۔ اب وہ پتا لگ جاتا ہے جیسے ایک سوال کرنے والے بھائی نے کہا کہ فلاں چینل دیکھیں تو یہ ہوتا ہے۔ ہر انسان کی فطرت میں ہے وہ یہ چاہتا ہے کہ وہ دیکھے جس پر وہ یقین رکھتا ہو تو خود بخود انسان وہ چیز آن کرتا ہے جس سے اسے اپنی پسندیدہ معلومات ملتی ہیں۔ میں ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ وہ آزادی ایسی ہے کہ ایک گراؤنڈ ہے جس سے نکلنے کا راستہ کوئی نہیں ہے، دروازہ کوئی نہیں ہے اس کے اندر چھوڑ دیا ہے کہ اب آپ اسی میں گول گول گھومیں۔

ہم نے کلاس میں ایک سرگرمی کی۔ آپ کو بتاؤں کہ پاکستان اسٹڈی سنٹر کا میرا تجربہ یہ ہے

کہ میرے پاس سندھی بولنے والے بچے آتے ہیں، ہمارے پاس گلگت بلتستان کے بچے آتے ہیں، ہمارے پاس کراچی کے بچے ہیں اور ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ گرمی کی چھٹیوں میں اندرون سندھ کی بچیاں، کراچی کی بچیوں کو کہہ رہی ہیں کہ تم ایک ہفتہ گزارنے کے لیے ہمارے ساتھ نواب شاہ چلو۔ ہم اللہ کے شکر سے اس میں کامیاب ہوئے ہیں کہ ان بچوں کو بتایا ہے کہ راست بازی کیا ہوتی ہے۔ اختلاف ہر معاشرہ میں ہوتا ہے۔ ہم نے کہا کہ کراچی پاکستان کا سب سے بڑا شہر ہے۔ یہاں جب پختون اتنی بڑی تعداد میں آئے ہوئے ہیں تو یہ پاکستان کا سب سے بڑا پختونوں کا شہر ہے۔ وہ آپ کی معاشی زندگی میں حصہ دار ہیں، کل وہ مطالبہ کریں گے کہ ہمیں سیاسی گنجائش بھی دی جائے۔ اگر ہاؤس آف کامن میں 2017ء میں پینتالیس غیر ملک نژاد جا کر بیٹھ سکتے ہیں تو کراچی کی صوبائی اسمبلی میں بھی پختون آ کر بیٹھ سکتے ہیں۔ پھر ہمارے بعض سندھی یہ کہتے ہیں کہ آبادی کا تناسب تبدیل ہو جائے گا۔ بالکل ہو جائے گا۔ اس کا حل یہ ہے کہ نقل مکانی کو کنٹرول کیا جائے۔ آپ ہری پور میں، خیبر پختونخواہ کے دوسرے علاقوں میں، ایبٹ آباد میں صنعت کاری کو ترویج دیں، کسی پختون کو ضرورت پیش نہیں آئے گی کہ اتنے خوبصورت علاقوں کو چھوڑ کر کراچی آئے جو ایک بدنما سے بدنما تر شہر بنتا چلا جا رہا ہے۔ تو یہ سب امور مینجمنٹ کے ہیں۔ یہ ریاستی کارکردگی کی چیزیں ہیں۔ آپ بنیادی ضروریات اور بنیادی حقوق کی تقسیم منصفانہ کریں، آپ دیکھیں گے کہ ہم آہنگی کا ماحول پیدا ہونا شروع ہو جائے گا۔ اس کے بعد ہم ایک دوسرے کی موسیقی سنیں گے، ایک دوسرے کی فلمیں دیکھیں گے، ایک دوسرے کی شاعری پڑھیں گے۔ ہمارا جو ہم آہنگ ہونے کا جذبہ ہے وہ پروان چڑھے گا۔

سوال و جواب

سوال: اپنی بات اور اظہار مافی الضمیر ہر صورت میں کرنا چاہیے، آپ سے کوئی اتفاق کرے یا نہ کرے۔ میں کراچی یونیورسٹی کا ایک واقعہ سناتا ہوں، 2009 یا 2010 میں کراچی یونیورسٹی میں

ایک بہت معتبر استاد کلاس میں پڑھا رہا تھا تو نجف میں واقعہ ہوا، حضرت علیؑ کے مزار پر حملہ ہوا تو کچھ اسٹوڈنٹ جو ایک تنظیم کے تھے انہوں نے کہا کہ آپ کلاس ختم کر دیں تو ٹیچر نے کہا یہ واقعہ نجف میں ہوا ہے کراچی میں نہیں ہوا، میں کلاس کیوں ختم کر دوں؟ پھر اس تنظیم کے لڑکے اندر آ گئے اور ٹیچر پر تشدد کیا۔ یہ بہت بڑا واقعہ تھا اب میرے جیسا کمزور آدمی جو بلوچستان سے تعلق رکھتا ہے، نہ اس کا کوئی آگے ہے نہ کوئی پیچھے، نہ ریاست مانتی ہے نہ ہی ریاست کے لوگ تو اگر میں کلاس میں بات کروں سی پیک کی تو کیا گارنٹی ہے کہ آپ مجھے زندہ پائیں گے؟

جواب: آپ نے جو مثال دی اس میں جو بھی گڑبڑ ہوئی اس میں نہ ٹیچر کا کوئی کردار تھا اور نہ سامنے بیٹھے ہوئے طالب علموں کا۔ کلاس میں جو کچھ ہوا، وہ آپ کے بقول باہر سے ہوا۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس طرح کی چیزیں ہوتی ہیں اور ماضی میں بھی ہوتی رہی ہیں۔ آپ نے ایک خاص مثال دے دی۔ جب یونین پر پابندی لگی تھی تو یہی کہا گیا تھا کہ طالب علموں کی تنظیمیں تشدد کرتی ہیں۔ میرا اپنا خیال بھی ہے کہ یہ انتظامی مسئلہ ہے۔ بنیادی طور پر یہ انتظامیہ کی ناکامی ہے کہ اپنے اپنے ادارے میں طلبہ تنظیموں کو کنٹرول نہیں کر سکیں۔ آپ اس انتظامی مسئلے کو ایک بہت بڑے اور مہلک نتائج کے مسئلے کی طرف لے جا رہے ہیں۔ یونین پر پابندی لگا کر زیادہ سے زیادہ آپ نے یہ کیا ہے کہ تشدد کی مرکزیت کو یونیورسٹی سے ذرا باہر نکال کر دروازے کے باہر کر دیا اور پھر وہ محلوں میں منتقل ہو گئی اور شہر میں منتقل ہو گئی۔ اور خیر سے ملک بھی پورا کا پورا تشدد آمادہ ہے کراچی میں تشدد کے اعداد و شمار ایک موقع پر سپریم کورٹ میں بھی پیش کیے گئے، یہ ایک پرتشدد شہر بن چکا ہے۔ اب اس ماحول میں ظاہر ہے کہ کلاس روم والی بات میں جو میری اپنی ایک دلیل تھی وہ اپنی جگہ ہے، لیکن یہ باہر سے جس طرح کی کارروائیاں ہو رہی ہیں اور پھر سارے طلب علم متشدد نہیں ہیں، چند طالب علم ہوتے ہیں جن کی پشت پناہی کچھ لوگ کرتے ہیں، یہ انتظامیہ کا مسئلہ ہے۔

دوسرا سوال آپ کا بالکل صحیح ہے۔ طلال اسد کا کام میں نے بھی دیکھا ہوا ہے، ماہر عمرانیات

ہے۔اس نے جس طرح مشرق وسطیٰ کی ریاستوں کے بارے میں لکھا ہے بالکل اس کا اطلاق پاکستانی ریاست پر بھی ہوتا ہے۔ یہ ریاست کاملاً ایک نظریہ ہے۔نظریاتی بنیاد پر قانون سازی کرتے ہیں،اسی کے نام سے عدالتوں سے اپنے فوجی اقتدار کو منواتے ہیں۔اسی کے نام پر عوام پر دباؤ ڈالتے ہیں۔میرا اپنا خیال یہ ہے کہ پاکستان کی ہر برائی کا خاتمہ عوام کی ایک تحریک سے ممکن ہے۔عوام کی تحریک کی شروعات کیسے ہوتی ہیں،سول سوسائٹی سے شروع ہوتی ہیں۔آپ جیسے فورمز سے شروع ہوتی ہے۔کہیں نہ کہیں سے یہ شروع ہوگی۔لیکن ان کی جو خامیاں ہیں وہ خود بھی مان رہے ہیں۔خود ہی انہوں نے جہاد کا نام دیا تھا خود ہی اسے فساد کا بھی نام دے رہے ہیں۔ان کو خود مسئلہ درپیش ہے کہ حکومت کی عمل داری باقی نہیں رہی۔ پاکستان کے ساٹھ فیصد علاقے پر ریاسی کی عمل داری اس طرح سے موجود نہیں ہے جیسے 1960، 1970ء میں تھی۔تو خود وہ بھی محسوس تو کر رہے ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ وہ خود اسے ایک جمہوری ریاست نہیں بنائیں گے،خود یہاں ایک جمہوری کلچر نہیں لائیں گے۔اس کے لیے محنت کرنا ہوگی اور وہ محنت جو اس وقت سیاسی جماعتیں کر رہی ہیں۔میں تو سمجھتا ہوں اس کے لیے عوام کی تحریک جب بھی شروع ہوگی،اس کی ذمہ داری میڈیا یا سیاسی جماعتوں،سب پر عائد ہوتی ہے۔

جواب: یہ سارے ڈھانچے ٹوٹنا شروع ہوتے ہیں اور نئی طرح کی چیزیں ہونے لگتی ہیں اور ان کو ہم روک بھی نہیں سکتے۔آج جتنا خاندانی نظام بچا ہوا ہے یہ بھی بیس سال کے بعد اس طرح سے نہیں ہوگا۔یورپ میں بھی اگر خاندان کا نظام ٹوٹا ہے تو کوئی ان کی خوشی سے نہیں ٹوٹا وہاں کے مادی حقائق کے نتیجے میں ٹوٹا ہے۔آج بھی مائیں کرسمس کی چھٹیوں کا انتظار کرتی ہیں،جب ان کے بچے گھر آئیں گے اور چھ دن گھر میں رہیں گے۔ یہ تو اب یہاں بھی ہو رہا ہے اور ہونا شروع ہو چکا ہے، یہاں بھی 'اولڈ پیپل ہوم' بننے شروع ہو چکے ہیں،آگے بھی بنیں گے۔دیکھنا یہ ہے کہ ہمیں کیا بچانا ہے اور ہم کیا بچا سکتے ہیں؟ کچھ چیزیں ہم بچا سکتے ہیں۔ مجھے ایک امریکی پروفیسر نے بتایا کہ امریکا کے وہ بچے نسبتاً بہتر ہیں یا بچ گئے ہیں جن بچوں کے گھر میں دادیاں اور نانیاں

تھیں کیونکہ ماں باپ کام پر چلے جاتے ہیں اور دادی اور نانی گھر میں ہے جو ہر وقت روک ٹوک کر رہی ہے کہ یہ کرو یہ نہ کرو۔یہی بچوں کے لیے ضروری ہوتا ہے۔یہ چیزیں ہمیں خاندانی نظام میں ملیں گی لیکن کچھ چیزیں ہمیں خود بھی کرنی چاہئیں۔کچھ ادارے جو کرپشن کی وجہ سے ختم ہو گئے ہیں،ان کو بحال کرنا چاہیے۔میرا یہ خیال ہے کہ کراچی میں کالج کی عمارتوں کے نام کی کوئی چیز نہیں،یہ کوئی تعلیمی ادارے نہیں ہیں۔جن کالجوں میں نہ طالب علم جا رہا ہوتا ہے نہ استاد آ رہا ہوتا ہے۔شام کو ٹیوشن سنٹرز پر اتنا رش ہوتا ہے کہ ٹریفک جام ہو جاتا ہے۔اب اس کا کوئی تعلق سماجی تبدیلی سے نہیں ہے،یہ سیدھا سیدھا کرپشن کا مسئلہ ہے۔آپ اپنے کالجز کو زندہ کریں تو بچے کے پانچ گھنٹے تو کالج میں گزرنے ہیں۔جیسا تیسا کچھ نہ کچھ تو نگرانی ہوگی،اگر سارے پروفیسر وہاں پر موجود ہوں۔

ایک اور چیز جو کراچی میں میں دیکھ رہا ہوں کہ یہاں کھیلوں کا رواج ختم ہو گیا ہے۔ایک زمانہ ہوتا تھا کہ ہر محلے میں کھیل کا میدان ہوتا تھا،پارک ہوتے تھے۔ہم لوگ گھر گھر سے چندے جمع کر کے،گھر سے زیادہ پیسے ملتے نہیں تھے تو اس سے دو روپے اس سے چار روپے لے رہے ہیں اور اس سے کرکٹ کھیلی جا رہی ہے،فٹ بال کھیلی جا رہی ہے۔ہمارے بچوں کی زندگیوں میں سے کھیل ختم ہو گیا ہے اور ان کے ہاتھوں میں موبائل آ گیا۔ایک میرے پاس واٹس ایپ پر تصویر آئی کہ بچے نانی سے ملنے کے لیے گئے ہیں اور نانی اکیلی بیٹھی ہوئی اور کوئی سترہ اٹھارہ بچے اپنے اپنے موبائل میں مگن ہیں۔میرا خیال یہ ہے کہ ہمیں کچھ امور انفرادی طور پر سوچنے پڑیں گے،کچھ اس میں اداروں کی بحالی پر توجہ دینی ہوگی۔ میں تو سمجھتا ہوں اسے پاکستان میں بطور پروجیکٹ لینا چاہیے کہ کھیلوں کو دوبارہ واپس لایا جائے۔

عیسائی مذہب کے لوگ جو پوری دنیا میں پھیلے ہوئے تھے،کوئی زمبابوے میں رہتا تھا،کوئی امریکا میں،کوئی جرمنی میں۔جب پریس آیا اور بائبل چھپ کر سب کے سامنے آئی تو یہ بکھری ہوئی کمیونٹی ایک 'کمیونٹی آف فیتھ' سے 'کمیونٹی آف ٹیکسٹ' بن گئی۔قرآن شریف کی طباعت ہوئی،وہ

کتابی شکل میں آیا تو مسلمان بھی اسی طرح منقلب ہوئی۔ میرا خیال یہ ہے کہ انٹرنیٹ کی ایجاد نے انسانی تہذیب کو اور کئی قدم آگے پہنچایا ہے اور اب ہم سب ایک دوسرے کے ساتھ اتنے قریبی طور پر جڑے ہوئے ہیں کہ انٹرنیٹ ہمارے والدین اور بچوں کی طرح بن چکا ہے۔ میں باپ ہوں تو انٹرنیٹ میری اولاد ہے۔ میں بیٹا ہوں تو انٹرنیٹ میرا باپ میری ماں ہے اور کل جن لوگوں کی گرفتاری ہوئی ہے، ان کے والدین کے آج کے بیانات یہ ہیں کہ ہمیں نہیں پتا کہ پوری رات یہ انٹرنیٹ پر کیا کرتا تھا۔ ابھی وہ ٹی وی والے بھی یہی پوچھ رہے تھے تو میں نے ان کو یہی کہا کہ اتنا بڑا سماجی بحران اب پاکستان میں ہمارے سامنے ہے، ہمارے سماجی ماہرین کو بٹھانا چاہیے، ہمارے ماہرینِ تعلیم کو بیٹھنا چاہیے اور ہمارے منصوبہ سازوں کو بیٹھنا چاہیے، یہ سوسائٹی جس جگہ پہنچ گئی ہے اب یہ ہمارے استاد بیچارے کنٹرول نہیں کر پائیں گے۔ یہ تو ایک سماجی انقلاب ہے اسے اسی سطح پر اوّل تو سمجھنا چاہیے کہ ہو کیا رہا ہے، پھر یہ کہ اس کا حل کیا ہے۔ پہلے یہ خیال پایا جاتا تھا کہ دینی مدارس کے بچے شدت پسندی کی طرف مائل ہوتے ہیں اور ہوتے بھی تھے لیکن پھر پتہ چلا کہ ہماری جو جدید ترین علوم کی یونیورسٹیاں ہیں جیسے لاہور میں لمز ہے، یہاں بی آئی بی ہے، کراچی یونیورسٹی ہے یہ سارے ادارے ہیں یہاں بھی یہ عنصر پہنچ گیا ہے۔ اس چیلنج کو سمجھنے کے لیے اساتذہ کی ہم آہنگی ٹھیک بات ہے۔ ہم اس پر بات کر لیں گے لیکن یہ جو ہماری سیاسی لڑائی جھگڑے چل رہے ہیں، جو ٹی وی چینلز ہمیں دکھا کر لڑائی کی طرف ہمارے ذہنوں کو مائل کرتے ہیں، اس سے ہٹ کر ہمیں دیکھنا ہے کہ تہذیبی سطح پر ہم کتنے بڑے بحران کی زد میں آ چکے ہیں۔ ہماری نئی نسل ہمارے ہاتھ میں نہیں رہی۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ کس طرح سے ہم بچوں پر اپنا اثر ورسوخ واپس لائیں، کس طرح معاشرے کے مختلف طبقوں اور یونیورسٹیوں، سکولوں اور کالجوں کو جوڑنے کی کوشش کریں، کس طرح ہم نصاب کی تبدیلی کے لیے کوشش کریں۔ نصاب کی تبدیلی ہمارے ہاں ایک عجیب سی سرگرمی ہوتی ہے۔ میٹنگ کی، مختلف لوگوں کو بلایا، بلانے والے بھی ایچ ای سی کے یا وزارتِ تعلیم کے کوئی صاحب ہوتے ہیں۔ مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ کوئٹہ سے کسے بلا لیں؟ جام

شورو سے کسے بلائیں؟ میں نے کہا بھائی آپ مرکز میں، وزارت میں بیٹھے ہوئے ہیں، مجھ سے آپ میری یونیورسٹی کے بارے میں تو بات کر لیں لیکن دیگر یونیورسٹیوں کا ڈیٹا آپ کے پاس ہونا چاہیے۔ مجھے کیا پتا کہ بلوچستان یونیورسٹی میں سیاسیات کے پروفیسر کون صاحبان ہیں۔ میٹنگ خانہ پُری سی ہوتی ہے، 12:30 بجے گھڑی دیکھنے لگتے ہیں کہ ظہر اور دوپہر کے کھانے کا وقت ہو رہا ہے، 4 بجے لوگوں کو گھر جانا ہوگا، اس کے بعد چھے ماہ تک کوئی فالو اَپ نہیں ہوتا۔ نئی نسل کی تعلیم و تربیت کے اقدامات کا یہ حال ہے، پھر درسگاہوں میں جس طرح کے مناظر سامنے آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں مستقل بنیادوں پر اس طرح کے مباحث کو آگے بڑھانا چاہیے، کورس ڈیزائن کرنے چاہئیں۔ مجھے یہ بھی تجربہ ہوا کہ سندھ میں کورس ڈیزائن کرنے کی جو مشق ہوئی اس میں کوئی 34، 35 لوگ جام شورو میں اکٹھے ہوئے۔ ان میں سکولوں کے استاد بھی تھے۔ کالج کے اساتذہ بھی تھے۔ بہت مخلص لوگ تھے کہ چاہتے تھے کہ کورس بہتر بنائے جائیں لیکن پتہ یہ چلا کہ کسی نے بیس سال پہلے، کسی نے اٹھائیس سال پہلے بی اے کیا ہوا ہے۔ اب ریٹائرمنٹ کے قریب ہیں، بیس سال سے وہی کتاب پڑھاتے چلے آ رہے ہیں۔ اب کورس تبدیل ہو رہا ہے تو وہ بھی پڑھا دیں گے۔ اساتذہ کے ریفریشر کورسز سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے، ہمارے ہاں جو زیادہ سے زیادہ بات کی جاتی ہے وہ نصاب کی تبدیلی ہوتی ہے۔ میرا کہنا یہ ہے کہ آپ نصاب بہت اچھا بنا لیں، آج کے زمانے کے لحاظ سے، جو آپ کے معاشرے کی اور ملک کی ضرورت ہو، جو اکیسویں صدی کا نصاب ہو، لیکن پڑھانے والے تو وہی لوگ ہوں گے۔ آپ سب میرے رفقائے کار ہیں، آپ سب کی عزت کرنا مجھ پر واجب ہے لیکن سچی بات یہ ہے کہ ہمارا پیشہ صرف پیشہ ہے، یہاں آگے بڑھنے کے لیے کوئی شرط نہیں، اب کچھ تحقیقی مقالوں کی اشاعت کی شرائط آ گئی ہیں، ورنہ پی آئی اے میں کوئی آگے بڑھتا ہے تو ریفریشر کورس کر رہا ہوتا ہے۔ بیوروکریسی میں لوگوں کو آگے بڑھنا ہو تو گریڈ 18 سے 19 میں 19 سے 20 میں، کبھی NIPA میں کورس ہو رہے ہیں، کبھی فلاں کالج میں کورسز ہو رہے ہیں، فوج میں مستقل بنیادوں پر کورس ہو رہے ہوتے ہیں۔ ایک گریڈ سے

اگلے گریڈ میں جانے کے لیے دنیا کا طریقہ یہی ہے۔ ہمارا پیشہ ایسا ہے کہ کسی ریفریشر کورس کی گنجائش نہیں ہے، کبھی سوچا ہی نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ ہم لوگ جو ہیں لیکچرز سے اسسٹنٹ پروفیسر ہونے کے لیے کچھ تحقیقی مقالوں کی شرائط ہیں۔ وگرنہ آپ کی مدتِ ملازمت مقررہ حد کو پہنچ جائے تو آپ خود بخود اپنے آپ کو اگلے مرحلے میں پائیں گے۔

ہم لوگ کیا پڑھتے ہیں، ہماری اپنی تدریس کیا ہے، ہم کتنے محققین کی پیروی کر رہے ہیں؟ ہمیں کتنا معلوم ہے کہ دنیا کتنی گہرائی سے پڑھ رہی ہے۔ پچھلے تین سال کے اندر میں نے پاکستان کے کسی بھی مصنف کو پاکستان کی ریاست کے موضوع پر نظریہ سازی کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ انڈیا سے ممبئی سے ایک رسالہ چھپتا ہے ''اکنامک پولیٹیکل ویکلی''۔ اس میں مقالات ہی مقالات ہیں، وہاں پاکستان کی ریاست پر بحث چل رہی ہے۔ کبھی عاصم سجاد اختر کا مضمون چھپتا ہے، کبھی ایک دوسرے صاحب کا چھپتا ہے۔ مقالات کا ایک سلسلہ وہاں شائع ہو رہا ہے۔ پاکستان میں کتنے لوگ ہیں جو معاشی و سیاسی موضوعات پر لکھتے ہیں۔ ہم ان لوگوں سے واقف نہیں جنھوں نے پاکستان کے حوالے سے نئی تاریخ لکھی ہے۔ پاکستان کے حوالے سے پچھلے پندرہ سال میں سیاسیات کے حوالے سے جو کچھ لکھا گیا ہے، ''دی لونگس'' آئی پھر ایک اور کتاب آئی، بے شمار کتابیں آ رہی ہیں لیکن وہ ہمارے میڈیا میں، ہمارے اخباروں میں کہیں جگہ نہیں پاتیں۔ ''ڈان'' میں کبھی ''بکس اینڈ آتھر'' چھپتا تھا، وہ بھی انہوں رسالہ بند کر کے ڈیڑھ صفحے پر چھوڑ دیا ہے، اس میں بھی وہ اب پتہ نہیں کیا چھاپ رہے ہوتے ہیں۔ علمی سرگرمی سے بے توجہی ہمارے لیے خطرے کی گھنٹی ہے۔ مری میں ہماری ایک ایسی ہی ورکشاپ تھی، کسی نے پوچھا کہ ہم کیا کر سکتے ہیں؟ میں نے کہا ہمارے لیے کرنے کو بہت کچھ ہے۔

ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں اس میں یونیورسٹیوں کے علاقے الگ نہیں ہیں۔ پینتیس ہزار بچے ہیں، انہی محلوں سے، اپنی گھروں سے اٹھ کر آ رہے ہیں، اساتذہ آ رہے ہیں، پھر واپس انہی محلوں، انہی گھروں میں جا رہے ہیں۔ تو یونیورسٹیاں کوئی جزیرے تو ہیں نہیں، وہ زمانہ گیا جب

کیمبرج اور آکسفورڈ جزیرے بنائے گئے۔ سرسید نے علی گڑھ میں ایک جزیرہ بنایا تھا۔ اب یہ جزیرے بھی ختم ہو رہے ہیں تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ میرا خیال، جو بہت ذاتی ہے، یہ ہے کہ کم از کم وہ چالیس یا پچیس یا پچاس منٹ جب میں کلاس ہوتا ہوں، وہ وقت میرا ہے۔ اس میں نہ ریاست کا زیادہ عمل دخل ہے نہ معاشرے کا۔ ایک دفعہ اگر میں اپنے طالب علموں کے ساتھ ایک ماحول بنا لوں اور ہم یہ فیصلہ کر لیں کہ جو گفتگو ہم کر رہے ہیں، ہم تنقیدی تحقیق کے اصول پر بحث کریں گے۔ آپ کوئی بھی سوال کرنے کے لیے آزاد ہیں۔ ہم جو کچھ بات چیت کریں گے، ایک جمہوری فورم کے طور پر کریں گے۔ آپ یہ نہ سوچیں کہ استاد کے کیا خیالات ہوں گے۔ میں تو پہلے دن ہی کھول کر اپنے بچوں کے سامنے اپنے خیالات رکھ دیتا ہوں کہ میں اپنی طالب علمی کے دور میں بائیں بازو کے ساتھ جذباتی طور پر وابستہ تھا، لیکن آپ کو کبھی یہ موقع نہیں ملے گا کہ آپ مجھ سے یہ کہہ سکیں کہ سر ہم نے آپ سے مختلف رائے کا اظہار کیا تھا تو آپ نے اس کی بنیاد پر ہمارے ساتھ زیادتی کی۔ تئیس سال پڑھانے کے بعد میں ریٹائرڈ ہوا۔ تئیس سال میں ایک بھی طالب علم نے آ کر مجھ سے یہ نہیں کہا کہ ہمارے خیالات کی بنیاد پہ آپ نے ہمارے ساتھ زیادتی کی۔ وہ مطمئن ہوتے، لیکن کیا یہ بات کم ہے کہ وہ اپنی بات کہنے کی پوزیشن میں آ گئے ہیں۔ ان میں خود اعتمادی اتنی ہو گئی ہے کہ وہ اپنی بات کہہ سکتے ہیں۔

میرا اپنا تجربہ ہے کہ طالب علم پر اعتماد کریں اور اسے وہ ماحول دیں، لہٰذا وہ ایک کلچر اور تہذیب کے دائرے میں رہتے ہوئے استاد سے بھی اختلاف کر سکے۔ وہ یہ کہہ سکے کہ سر جو آپ کی تعریف ہے، اس سے میں مطمئن نہیں ہو رہا ہوں۔ میں کوشش کروں گا اسے مطمئن کرنے کی پھر بھی اگر وہ مطمئن نہیں ہوتا تو میں کہوں گا ٹھیک ہے، آپ ٹھیک ہیں۔ اگر یہ کلچر ہم اپنی اپنی کلاس میں کر دیں تو پھر آپ دیکھیں گے کہ باہر کے اثرات سے کم از کم آپ نے کسی حد تک اپنے آپ کو محفوظ کر لیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ کے بچے آپ کی نئی نئی باتوں سے متاثر ہوتے ہیں۔ آپ انہیں کتنے نئے خیالات دیتے ہیں کیونکہ جو بچے ہمارے سامنے بیٹھے ہوتے ہیں ان کی معلومات

اوران کی رسائی بہت زیادہ ہوچکی ہے۔ میں IBA میں پڑھا رہا تھا، میں نے کہا کہ 1996 میں ایک مضمون چھپا ''ہسٹری فرام بیلو'' اور میں نے کہا کہ یہ شاید 1996 یا 1997 تھا، میں کوئی ٹائٹل لکھ رہا تھا۔ ایک لڑکی نے موبائل کھولا اور مجھے کہا سر 1996۔ اتنے ذہین بچوں کے سامنے ہم بیٹھے ہوئے ہیں۔ اگر ان کے سامنے ہم اپنے آپ کو جاننے والا ثابت کررہے ہوں گے تو ضرور وہ آپ سے متاثر ہوں گے۔ وہ آپ کو توجہ دیں گے۔ پھر آپ ان کے اندر ایک ثقافتی مکالمہ پیدا کروائیں۔

ہمارے ہاں شروع سے پاکستانی قومیت کا ایک بیانیہ چلا آرہا ہے۔ یہ وہ نہیں ہے جو قائداعظم نے 11 اگست کی تقریر میں دیا تھا کہ ریاست غیر جانبدار ہوگی، مذہب لوگوں کا ذاتی معاملہ ہوگا۔ قائداعظم نے سیکولرزم کا لفظ نہیں استعمال کیا تو اب میں بھی اصرار نہیں کرتا کہ آپ سیکولرزم کہیں لیکن جوان کا ویژن تھا، آپ اس ویژن کے مطابق اپنے ملک کا قومی بیانیہ بناتے جو کہ ہم نے نہیں بنایا۔ ہم نے پاکستانی قومیت کا بیانیہ یہ بنایا جو ہم صبح شام سنتے ہیں کہ میں سندھی نہیں ہوں، میں پنجابی نہیں ہوں، میں بلوچ، پٹھان نہیں ہوں، میں پاکستانی ہوں۔ یہ چلے گا نہیں، چلتا بھی نہیں ہے ابھی تک بھی نہیں چلا۔ اس لیے کہ کسی بھی انسان کی متعدد شناختیں ہوسکتی ہیں۔ اس میں کیا برائی ہے کہ ہم یہ بات قبول کریں کہ ہم سندھی بھی ہیں ہم پاکستانی بھی ہیں اور پھر ہمارا کوئی مذہب بھی ہے۔ وہ ہم مسلمان بھی ہوسکتے ہیں، عیسائی بھی ہوسکتے ہیں۔ یہ جو پاکستان کے مختلف ثقافتی خطے ہیں، ان کی تاریخیں ہیں، ان کی تہذیبی شناختیں ہیں، ان کا ادب ہے۔ اس کے اثبات پر اگر پاکستانی قومیت کا بیانیہ قائم کرتے ہیں تو وہ دیرپا ہوگا، ورنہ جو پاکستانی قومیت ہم بنائیں گے وہ صرف خالی نعروں کی حد تک ہوگی اور وہ صرف 14 اگست کو یا 23 مارچ کو نظر آئے گی، لیکن آپ کی عام زندگی میں وہ چیز نظر نہیں آرہی ہوگی۔

سوسائٹی کی سطح پر میں پھر یہی کہوں گا کہ وہاں بھی چار میجر چیزیں ہیں جو اس موضوع کی مناسبت سے میں سامنے رکھنا چاہوں گا۔ ہمارے معاشرے کے کچھ مزاج بن گئے ہیں۔ ایک تو

ہماری سوسائٹی کا مزاج جو ہمیں بچپن سے دیا جاتا ہے، جسے میں نرگیست کہتا ہوں، اپنے آپ کو بڑا سمجھنا، اپنے آپ کو بہترین سمجھنا، ہم ہیں پاکستانی ہم تو جیتیں گے، ٹھیک ہے کھیل کی حد تک کہہ لیجئے لیکن یہ جو ہمارے ذہنوں میں ڈالا گیا ہے کہ ہم دنیا کی کوئی ارفع ترین مخلوق ہیں ایسا ہے نہیں۔ یہ جب تک آپ اپنے دائرے میں محدود رہیں گے، آپ بے شک اپنے آپ کو ارفع مخلوق سمجھتے رہیں لیکن اگر ہم دنیا کے ساتھ موازنہ کرتے ہیں، جب آپ برطانیہ کے لوگوں سے ملتے ہیں، نیوزی لینڈ، امریکا کے لوگوں سے ملتے ہیں، ہندوستانیوں سے ملتے ہیں تو پہلا احساس ہمیں یہ ہوتا ہے کہ یہ بھی ہم جیسے لوگ ہیں، ان میں بہت اچھے لوگ بھی ہیں، ان میں خراب لوگ بھی ہوں گے۔ جونہی آپ کا یہ برتاؤ بنے گا تو اس کے نتیجے میں آپ دوسروں کے ساتھ ہم آہنگ ہونا سیکھیں گے اور آپ کو اندازہ ہوگا کہ دنیا کے ہر معاشرے میں اچھے لوگ بھی ہوتے ہیں اور برے لوگ بھی ہوتے ہیں، بہت نیک لوگ بھی ملیں گے اور بہت کمینے لوگ بھی ملیں گے اور یہ ہر معاشرے کے اندر پائے جاتے ہیں۔ نرگیست کا یہ احساس ہر جگہ ہے، آپ اردو کے اخباری کالم اٹھا کر دیکھ لیں، ٹی وی چینلز کے پروگرام دیکھ لیں، ایسا لگتا ہے کہ ہم کوئی خصوصی طور سے بنائے ہوئے ہیں، ہماری کیمسٹری کچھ اور ہی ہے اور جو باقی دنیا ہے وہ پسماندہ ہے۔ تاریخ میں بھی جو کچھ تھا وہ ہم نے ہی کیا تھا دوسروں نے کچھ نہیں کیا ہوا۔ اگر اور دوسروں نے کچھ کیا ہوا ہے تو وہ سب کچھ انہوں نے ہم ہی سے لیا ہوا ہے۔ سوال یہ ہے کہ آج پھر کیوں پچھلے تین سو سال سے کتنی ایجادات ہم لوگوں نے کی ہیں۔ ہماری طرف سے کونسی تحقیق دنیا کے سامنے آرہی ہے۔ ہمارے ہاں کیا پیدا ہورہا ہے؟ ہماری جامعات کتنا فروغ پارہی ہیں؟ آپ بتائیں؟ یہ ایک جھوٹا احساسِ تفاخر ہے، یہ ہمیں دنیا کا شہری نہیں بننے دے رہا۔ یہاں ہمیں حقیقت پسند ہونے کی ضرورت ہوگی۔

دوسری اہم چیز یہ کہ ایک نظریۂ سازش ہے جو ہمیں شروع سے بتا دیا جاتا ہے کہ جو کچھ ہمارے ساتھ مسائل ہیں، یہ دوسروں کی سازش کا نتیجہ ہے۔ ٹھیک ہے ہوئی ہوں گی، دنیا میں

سازشیں ہوتی ہیں،لیکن ہمارے ہاں ہر چیز میں ہے، ہمارے ہاں سیلاب آجائے ، ہمارے ہاں معیشت ناکام ہوجائے ، ہماری سیاست میں کوئی خامی ہوجائے ، ہمارا سی پیک تھوڑا بہت بگڑ جائے ، ہر چیز کے پیچھے ہم دوسروں کی سازش دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ یہ جونظریۂ سازش ہے اس نے بھی ہمیں کوئی صحت مند انسان نہیں بننے دیا۔اس نے ہمیں غافل رکھا ہے کہ اپنی خامیوں کو نہ دیکھواور صرف یہ سوچ سوچ کر مطمئن ہوجاؤ کہ باہر کچھ سازشی لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ مذہبی تفرقہ، انتہا پسندی ہے،فرقہ واریت ہے، بہت آسانی سے کہہ دیا جاتا ہے کہ دشمنوں کی سازش کا نتیجہ ہے۔ جو کچھ پاکستان میں ہورہا ہے وہ ہندوستان کروارہا ہے یا اسرائیل کروارہا ہے۔ وہ بھی کچھ نہ کچھ کروا رہے ہوں گے لیکن آپ اپنے معاشرے کے اندر دیکھیں گے۔ آپ اپنے حقائق کو دیکھیں گے کہ آپ اپنی فرقہ پسند تنظیموں کے لٹریچر اٹھا کے دیکھیں گے، آپ یہ دیکھیں گے کہ مسجدوں سے کس قسم کے خطبے دیے جاتے رہے ہیں۔ کیا یہ ہندوستان نے کروایا؟ کیا یہ سازش ہوئی ہے؟ یہ چیزیں آپ کے ملک کے اندر ہورہی ہے لیکن ہم ماننے کو تیار نہیں ہیں۔ اب اس کے بعد آپ یہ دیکھیں گے کہ ہمارے ہاں ماضی میں ایک کلچر تھا کہ نظریات کچھ بھی ہوں ان نظریات کے ساتھ آپ ایک دوسرے کے ساتھ رہ سکتے تھے اور اب سے چالیس پینتالیس سال پہلے تک یہ کلچر بہت نمایاں تھا۔ یعنی مولانا مودودی اور جوش ملیح آبادی ایک ساتھ بیٹھ سکتے ہیں۔ جوش ملیح آبادی کو پتہ چلا کہ مولانا مودودی کراچی آئے ہوئے ہیں اور پی آئی بی کالونی میں حکیم اقبال کے گھر قیام ہے تو وہ دوپہر کو ان کے گھر پہنچ گئے۔ انہیں بتایا گیا کہ مولانا کے آرام کا وقت ہے اور وہ سو رہے ہیں۔ جوش صاحب نے کہا کہ نہیں نہیں میں تو جاؤں گا اور اپنے ہاتھ میں پکڑی چھڑی سے دروازے پر دستک دی اور کہا کہ قوم کو جگا کے خود سو گئے۔ اس کے بعد ان کی نشست ہوئی گپ شپ ہوئی۔ بابا ذہین اور فیض احمد فیض کا واقعہ میں ایک جگہ لکھ بھی چکا ہوں کہ ذہین تاجی، فیض احمد فیض صاحب سے کہہ رہے ہیں کہ فیض بھائی ہمیں تو تم سے مل کر مزہ نہیں آیا۔ ہم تو ایک کافر سے ملنا چاہ رہے تھے تم میں سے پھر ایک تھوڑا سا مسلمان نکل آیا۔ تو یہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ

بیٹھتے تھے، مذاق کرتے تھے۔ ادبی اور نظریاتی اختلافات رکھنے کے باوجود انجمن ترقی پسند مصنفین کے لوگ حلقہ اربابِ ذوق کی محفلوں میں بیٹھتے تھے اور حلقے کے لوگ ترقی پسندوں کی محفلوں میں بیٹھتے تھے۔ یہ کلچر ہمارے ہاں تھا۔ یہ کلچر 1970ء کے عشرے کے بعد ختم ہوا ہے اور اس میں ظاہر ہے کہ ریاست کا ایک حتمی کردار ہے۔

میرا اپنا یہ خیال ہے کہ پاکستان میں پچھلے ستر سال میں ایک بڑا عامل جس نے پاکستانی معاشرے کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے، وہ افغانستان کے معاملات میں پاکستان کی مداخلت ہے۔ 1978 میں دو بڑے واقعات ہوئے، ایران میں انقلاب آیا، افغانستان میں روسی فوج آئی۔ امریکا نے ہمیں یہ باور کروایا کہ روسی فوج تمہارے تک پہنچنا چاہتی ہے۔ گرم پانیوں تک پہنچنے کا تھیسز انیسویں صدی کا تھیسز تھا۔ بیسویں صدی میں گرم پانی تک جانے کی کسی کو ضرورت بھی نہ تھی۔ اب امریکا کتنے دور میزائل پھینکتا ہے اور وہ افغانستان میں جا کر گرتے ہیں تو آج کی ٹیکنالوجی کے دور میں کل پرسوں جو نارتھ کوریا نے میزائل کے تجربے کیے ہیں، انہوں نے بتادیا کہ ہم دنیا کے کسی بھی کونے میں یہ میزائل پہنچا سکتے ہیں۔ آئی لینڈ جانے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ لیکن چونکہ ہمیں اپنے لوگوں سے ووٹ لینا تھا اور انہیں بتایا تھا کہ یہ تو ہمارے ملک پہ قبضہ کر لیں گے، لہٰذا ہم نے امریکا کے ساتھ کھیل کھیلا، ہم نے جہادی تنظیمیں بنائیں اور ان کی تربیت کی، ان کو سہولیات فراہم کیں۔ عرب ملکوں سے جہادی بلا کر یہاں بٹھائے، پچھلے سال تک ہم خود یہ کہہ رہے تھے کہ تیئس ہزار تک جہادی یہاں موجود ہیں اور اسے جہاد کہا گیا تھا، آج کا چیف آف آرمی اسٹاف کا بیان پڑھ لیجئے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ جہاد یہ فساد بن گیا ہے اور اب ہم ردالفساد چلا رہے ہیں اور جہاد کا اعلان تو ریاست کرسکتی ہے تو وہ سارے جہاد ہو رہے تھے۔ گیارہ سال افغانستان جہاد میں شراکت ہوئی۔ پاکستان کا سرکاری مؤقف یہ تھا کہ ہماری یہاں پہ کوئی مداخلت نہیں ہے، کوئی عملی حصہ داری نہیں ہے، ہم افغانوں کی صرف اخلاقی تائید کر رہے ہیں۔ آپ 1978 سے 1989 تک یہی کہتے رہے۔ ریاست کا کوئی ایسا بیان نہیں ہے جس میں یہ کہا گیا ہو کہ

ہم اس جہاد میں عملی حصہ لے رہے ہیں، سب کچھ غیر سرکاری طور پر تھا۔ اس کے نتیجے میں کیا ہوا؟ یہ ہوا کہ آپ نے اتنی بڑی فورس تیار کر لی، ایک ایسا جن بوتل سے نکالا جسے اب بوتل میں ڈالنا آپ کے لیے مشکل ہے اور جب افغانستان سے ایسی فوجیں چلی گئیں تو اب یہ لوگ کیا کریں، انہوں نے ایجنڈے بنائے اور ایک دوسرے کے خلاف لڑنا شروع کیا۔

1947 میں پاکستان میں پانچ مذہبی تنظیمیں تھیں۔ اور 2002 کے اندر ان کی تعداد 245 تک پہنچ چکی تھی۔ لاہور جو اس وقت ایشیا کا سب سے بڑا جہادی مرکز ہے جہاں یہ جہادی تنظیموں کے صدر دفتر موجود ہیں۔ اب جو جہاد ہے، جس پر عامر رانا صاحب کی بڑی اچھی کتاب ہے، جس میں انہوں نے بڑی تفصیل میں یہ دکھایا ہے کہ کس طرح سے تین نسلیں جہادی میدان میں آ چکی ہیں۔ پہلی نسل جو 1979,1978 کی نسل تھی، دوسری وہ جو 2001 میں نائن الیون کے واقعے کے بعد منظر عام پہ آئی اور تیسری 2007 میں لال مسجد اسلام آباد کے قصے کے بعد سامنے آ گئی۔ اب صورت حال یہ ہے کہ جنہوں نے انہیں بنایا تھا، وہ انہیں کنٹرول نہیں کر پا رہے۔ یہ جہادی عنصر عالمی سطح پر پھیل چکا ہے، یہ اپنی جہادی صلاحیتیں بین الاقوامی جہادی مارکیٹوں میں لے کر جاتے ہیں، یہ اپنی قیمت لگاتے ہیں، داعش والے چاہیں تو وہ ان کو ہائر کر لیں اور کوئی چاہے تو وہ ان کو ہائر کر لے۔ ایک عامل جو ہمارے تعلیمی نظام کے حوالے سے اہم ہے، یہ ہے کہ ہم جس دنیا میں رہ رہے ہیں اس میں ذرائع ابلاغ اتنا بڑا تغیر لائے ہیں کہ انسانی تاریخ میں اتنا بڑا انظامِ ابلاغ کبھی نہیں آیا تھا۔ جب پریس کی ایجاد ہوئی تو اسے ایک بہت بڑا کام سمجھا گیا تھا اور ایک بہت بڑے ماہرِ سماجیات تھے، بیلیر ین، ان کی پچھلے سال وفات ہوئی ان کی کتاب ہے "Imagine Communities"۔ انھوں نے اپنی کتاب میں لکھا کہ پریس کی ایجاد نے 'کمیونٹی آف فیتھ' کو 'کمیونٹی آف ٹیکسٹ' بنا دیا۔

مبشر زیدی

سوشل میڈیا کے حوالے سے یہ کہوں گا کہ والدین اور اساتذہ دونوں کو اپنے بچے پہ تھوڑی

بہت نظر رکھنی چاہیے، کچے ذہن ہوتے ہیں وہ کچھ بھی کر دے، وہ کچھ بھی تلاش کر لے، کوئی نہ کوئی ویڈیو اس کے سامنے ہو گی۔ کہیں وہ بچے ایسی چیزیں تو نہیں پڑھ رہے جو انہیں نہیں پڑھنی چاہئیں تھی یا ایسا تو کچھ نہیں دیکھ رہے جو انہیں نہیں دیکھنا چاہئے؟ آپ کو کچھ زیادہ مشکل کام نہیں کرنا، سوشل میڈیا میں فلٹرز موجود ہیں، آپ ان فلٹرز میں جائیں، ان کی سیٹنگ ایسی کر دیں کہ بچے کو وہ چیزیں نہ دکھائے۔ لیکن ہم یہ محنت خود بحیثیت والد یا بحیثیت استاد یہ چیز کرنے کو تیار ہی نہیں ہیں۔ ہم بچوں کو بتائیں کہ چونکہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اگر میں اپنے بچوں سے پورن گرافی کے اوپر بات کروں گا کہ حرام ہے اس کو نہیں دیکھنا ہے، تمہاری یہ عمر نہیں ہے، اسی طرح مذہبی معاملات پر بھی میں اپنے نظریات اپنے بچے پر ضرور تھوپوں گا، اس کو کبھی یہ نہیں کہوں گا کہ یہ چیزیں بھی پڑھ لو، دوسرے مذاہب کی چیزیں پڑھنا تو دور کی بات ہے۔ بچپن میں نماز پڑھنے میں جو بھی مسجد ہے قریب ہے مجھے اس میں جانے میں تو کوئی مسئلہ نہیں ہوتا تھا۔ آج میں جس بھی فرقے سے تعلق رکھتا ہوں میں دوسرے فرقے میں جاؤں گا تو سارے نمازی نماز چھوڑ کر یہ دیکھنا شروع کر دیں گے کہ میں نے ہاتھ باندھے ہوئے ہیں یا کھولے ہوئے ہیں۔ ہم نے خود اپنے ساتھ تباہی کی۔ ہم آہنگی اسی صورت میں آئے گی جب ہم یہ چیزیں سمجھنا شروع کر دیں گے کہ مسجد تو اللہ کا گھر ہے وہاں تو غیر اسلامی لوگوں کو بھی اجازت ہے کہ وہ آ کر پناہ بھی لے سکتے ہیں۔ ہم آپس میں ایک دوسرے کو پناہ دینے کے لیے تیار نہیں۔ مجھے بتائیں کہ ہم نے اتنے سارے فرقے بانٹ لیے ہیں اور اگر یہی بات ہم سے ہمارا بچہ پوچھ لے کہ مجھے بتائیں تو کیا جواب ہے۔

میرے بچوں کے ساتھ کیا ہوا؟ ان کو دوسری تیسری جماعت میں کہہ دیا گیا وہ مجھے آ کر کہنے لگے کہ بابا وہ کہہ رہے ہیں کہ تم لوگوں کا تو دین یہ ہے وہ ہے۔ بچے اپنے اساتذہ سے بہت زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ اس معاملے میں اساتذہ پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ بچوں کو بالکل ان چیزوں سے دور رکھیں جب تک وہ یہ نہ سمجھیں کہ اب ان کا ذہن اس چیز کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو گیا ہے۔ مذہبی منافرت پھیلانے میں آپ نے جو بات کی بالکل ایسا ہی ہے۔ اس طرح کے

بہت سارے چیلنجز کھلے ہوئے ہیں۔ مثلاً ایک معروف اینکر اگر رمضان میں یہ کہہ رہے ہیں کہ جہاز دے رہا ہوں، میں گاڑیاں دے رہا ہوں، اب یہ ایک لالچ پیدا کر رہے ہیں ناں۔ لوگ اس پروگرام میں انعام کے لیے آ رہے ہیں۔ میں نے لوگوں کو منتیں کرتے ہوئے دیکھا ہے کہ عمرے کا ٹکٹ دے دو۔ ہم چونکہ ہر چیز کو بیچ رہے ہیں دین کو بھی بیچ رہے ہیں۔ اخبار میں آج ن لیگ نے اشتہار دیا ہے اس لیے آج اس کا مؤقف زیادہ واضح ہوگا، اگلے دن پی ٹی آئی کا اشتہار مل گیا، اس کے مؤقف کو زیادہ اہمیت مل گئی۔ اپنی ذمہ داری سے ہم کچھ بھی نہیں کر رہے ہوتے تو ہمیں اپنی ذمہ داری کا احساس کرنا چاہیے۔

ہمارا آئین ضرور یہ بات کرتا ہے، لیکن اگر وہ غلط ہوتے ہیں تو صحافت میں ہمیں آرٹیکل 19 کے تحت ایک تحفظ حاصل ہے۔ میں نے 2000ء میں ایک مضمون لکھا تھا، اس وقت کے چیف جسٹس ریاض شیخ کے بارے میں کہ انہوں نے CDA میں معذوروں کے کوٹے سے پلاٹ لیا ہے۔ میں نے لکھا، انہوں نے مجھے بلا لیا۔ میں ان کے کمرے میں چلا گیا۔ اس وقت میں نوجوان تھا۔ انہوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا، بیٹا: تمہارا مالک میرا دوست ہے، میں نے کہا کہ ٹھیک ہے ہوں گے، میں ایک صحافی ہوں، آپ اپنا مؤقف دے دیں۔

انہوں نے کہا نہیں ایسی بات نہیں ہے اور اچھا تم نے کچھ لکھ دیا ہے اور اب میں نے وہ پلاٹ تبدیل کر لیا ہے اور کہیں اور لے لیا ہے اور وہ بھی تھا، میں آپ کو صرف اتنا بتانا چاہتا ہوں اگر اس طرح کی چیزیں ہمارے ہاں ہو رہی ہیں۔ اسی طرح فوج کے اندر 2000ء میں غالباً میں نے لکھا تھا کہ ہم 90ء کو سیاسی بدعنوانی کا عشرہ کہتے ہیں، تو میں نے کہا میں دیکھوں کہ ہماری مسلح افواج نے کتنی کرپشن کی ہے۔ میں جنرل آفس چلا گیا اور وہاں سے ان کے پورے دس سال کے آڈٹ نکال لیے تو میں نے محسوس کیا کہ اس طرف بھی اتنی ہی کرپشن ہے۔

تو اس طرح میں یہ کہتا ہوں کہ شاید ہماری سوسائٹی نے کرپشن کو قبول کر لیا ہے اب ہمیں برا نہیں لگتا کہ ہم کہتے ہیں کہ میں محفوظ ہوں وہ کر رہا ہے۔ ہمارے مزدور سے لے کر اوپر کی سطح تک

سب نے اسے قبول کر لیا ہے۔ ہمارے میڈیا مالکان بھی اس میں اتنے ہی شریک ہیں۔ جو بھی آپ کو اس وقت میڈیا سے بیانیہ مل رہا ہے، اس میں سے آپ کو خود سچائی اور مصالحہ الگ الگ کرنا پڑے گا۔ یہ بدقسمتی ہے لیکن یہی سچائی بھی ہے، آپ لوگ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔

بچوں کے پروگرام کے بارے میں سوال تھا۔ بالکل درست بات ہے کسی بھی نیوز چینل پر بچوں کا ایک بھی پروگرام نہیں ہو رہا، اور اگر اقوام متحدہ کچھ پیسے دے دے تو شاید ہم کوئی بچہ بٹھا دیں گے۔ لیکن یہ بھی پیسے ملنے پر ہوگا۔ اصل میں ہماری ریاست نے ایک تصور دے دیا ہے کہ جو بھی ہمیں پیسے دے گا ہم اسی ڈگر پر چل پڑیں گے، وہ ہوتے ہوتے میڈیا بھی پہنچ گیا کہ جو پیسے دے گا ہم اسی کے ہوں گے کیونکہ ہم کرائے کے فوجی ہیں، ہم صحافی ہیں لیکن کوئی پالیسی نہیں ہے۔ اس میں یہ کہا جاتا ہے کہ ہم صحافت کے تمام لوگوں کو اس میں موقع دیتے ہیں، تو کیا آپ اس بیانیے کو موقع دے رہے ہیں جو لوگوں کے ذہنوں میں ہے۔ کچھ چیزوں کو صحافیوں نے کوشش کر کے مقبول بنایا ہے، اس لیے لوگوں کو یہ بتا رہے ہیں کہ جناب یہی سچ ہے، ہر ایک کا اپنا اپنا سچ ہے۔ اسی چیز نے منتظم کے دفتر کو بالکل کمزور کر دیا ہے، اب صرف مالکان کی خواہش پر خبریں چھپتی ہیں، کالم بھی اسی طرح چھپتے ہیں، اگرچہ سارے نہیں لیکن بہت زیادہ۔

تیسری نشست

اساتذہ برائے تعلیم

ڈاکٹر سید جعفر احمد

بہت بہت شکریہ! بہت سے سینئر موجود ہیں، بہت سے جونیئر ہیں، اپنے قبیلے میں اپنے آپ کو دیکھ رہا ہوں، بڑی خوشی کی بات ہے۔ کراچی یونیورسٹی کے بہت سے اساتذہ ہیں، سندھ کے دوسرے شہروں سے، بلوچستان سے، بہت سے دوست آئے ہوئے ہیں۔ آپ لوگوں کی چیزوں سے ہم مستفید ہوتے رہتے ہیں اور ہماری بھی آواز کسی نہ کسی شکل میں آپ تک پہنچتی رہتی ہے۔

آج جو موضوع دیا گیا ہے وہ ہے اساتذہ برائے تعلیم۔ میرے خیال میں یہ 'ٹیچر فار ایجوکیشن' کا ترجمہ کیا گیا ہوگا۔ تعلیمی عمل کے تین بڑے اجزاء ہوتے ہیں۔ ایک تو خود اساتذہ ہیں، پھر طالب علم ہیں، پھر نصاب تعلیم ہے۔ ان تینوں کی ہم آہنگی سے نظام تعلیم آگے بڑھتا ہے۔ اس کی پشت پر دوسری چیزیں کام کرتی ہیں۔ میں پشت پر جو چیزیں کام کر رہی ہوتی ہیں، پہلے ان پر بات کروں گا کیونکہ سماجی ہم آہنگی ہو یا عدم رواداری ہو دونوں طرح کے رجحانات ان تین مقامات سے پھوٹتے ہیں۔ نہ طالب علم عدم رواداری پھیلا رہے ہوتے ہیں، نہ اساتذہ بحیثیت ایک طبقے یا بحیثیت ایک گروہ ایسا کام کر رہے ہوتے ہیں۔ اگر کر بھی رہے ہوتے ہیں تو ان کا کردار جزوی ہوتا ہے۔ نصاب کا بڑا اہم کردار ہے لیکن میں نصاب کو بھی تمام تر ذمہ دار نہیں ٹھہراتا۔ جو دو بنیادی چیزیں پیچھے کام کر رہی ہوتی ہیں وہ ایک ریاست ہوتی ہے اور دوسرا معاشرہ ہوتا ہے۔ ریاست اور معاشرے کو زیرِ بحث لائے بغیر ہم کسی نظام تعلیم پر بات نہیں کر سکتے اور اس کے رجحانات کو نہیں جان سکتے۔

ریاست اور معاشرے میں ایک بڑا قریبی رشتہ ہوتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ پاکستان کے تناظر میں بات کریں تو مجھ جیسا طالب علم جس نے سیاسیات کی تعلیم حاصل کی ہو، جو ہر چیز کو تاریخ کے تناظر میں دیکھنے پہ مجبور بھی ہے، اس کے نزدیک حال کے کسی بھی مسئلے کا تجزیہ ناگزیر طور پر ماضی اور حال کے تعلق کو سمجھنے تاریخ اور سیاسیات کے تعلق کو سمجھنے پر منحصر ہے۔

میرا خیال یہ ہے کہ ہم پہلے تو یہ دیکھیں کہ ریاست کی سطح پر کیا ہوتا رہا ہے جو عدم رواداری آج پاکستانی معاشرے میں ہے۔ اس کے پیچھے ہماری ریاست کے چار بنیادی عناصر کارفرما نظر آتے ہیں۔ ریاست کے اوپر بھی بہت سارے عوامل ہوں گے، جنہیں ہم مختلف موضوعات کے ذیل میں زیر بحث لا سکتے ہیں لیکن جو عدم رواداری کی گفتگو ہو رہی ہے اور مذہبی عدم ہم آہنگی کی بات ہو رہی ہے، اس تناظر میں پاکستانی ریاست کے چار کریکٹرز کو زیر بحث لانا میرے لیے بہت ضروری ہے۔

پہلی بات تو یہ کہ پاکستان کی ریاست دنیا کی بیشتر ریاستوں کی طرح ایک اتھاریٹیرین سٹیٹ ہے۔ ریاست کی ایک تعریف یہی ہے کہ جس کے پاس جبر کرنے کا کل اختیار ہو۔ ریاست کے پاس طاقت ہے، پولیس ہے، تھانے ہیں، عدالتیں ہیں، فوج ہے۔ لیکن یہ جو عمومی ریاست کے ذرائع ہیں، ہماری ریاست اس سے سوا ہے۔ ان سے آگے بڑھ کر پاکستانی ریاست ایک مابعد نوآبادیاتی ریاست ہے۔ نوآبادی دور کی جو ریاست تھی، جو استعماری ریاست تھی، وہ شہریوں کے ساتھ جس طرح کا رشتہ رکھتی تھی، وہ بنیادی طور پر کنٹرول کا رشتہ تھا۔ اور ریاست کا عوام کے درمیان تعلق ریاست اور شہری کا تعلق نہیں تھا بلکہ حکمران اور رعایا کا تعلق تھا۔ ہمارے لوگ رعایا تھے۔ ہم نے پاکستان اس خیال سے بنایا تھا کہ پاکستان ایک جمہوری ریاست ہوگا ہم ریاستی اجارہ داری کو ختم کریں گے اور پاکستان کے باشندے/شہری بنیں گے، رعایا بھی ہوں گے۔ لیکن ستر سال بعد بھی ہم اپنے آپ کو محض رعایا پاتے ہیں۔ ہمارے کالجوں کے لیکچرار تعینات ہوتے ہیں تو صوبائی وزیران کے ہاتھ میں تقرر نامے اس طرح سے تھمارہے ہوتے ہیں کہ جس طرح نوکری انہوں نے اپنی جیب سے دی ہو۔ میں جامعہ کراچی میں اکثر ایک بس چلتے ہوئے دیکھتا ہوں جس کے پیچھے میئر صاحب کا شکریہ لکھا گیا ہے کہ انہوں نے عنایت کی ہے۔ تو نوآبادیاتی ریاست میں یا قبل نوآبادیاتی ریاست میں جو کچھ عوام کو ملتا تھا وہ عنایات تھیں، وہ رعایتیں تھیں، وہ حق نہیں تھے۔ ہم نے یہ سمجھا تھا کہ پاکستان میں ہمیں جو کچھ ملے گا وہ حقوق ہوں گے لیکن وہ حقوق ہمیں نہیں ملے۔ اور اگر آئین میں جا کر کچھ حقوق ملے بھی تو آئین ایک مقدس دستاویز نہیں بن سکا، روبہ عمل نہیں لایا جا سکا۔ ہم نے آئین بنایا لیکن وہ بھی ہمارے کلچر کا حصہ نہیں بن سکا۔ ہمارے طبقہ اشرافیہ کا آئین پر کوئی یقین نہیں ہے، اور جب اعلیٰ طبقے کی آئین کے ساتھ کوئی کمٹمنٹ نہ ہو تو دیگر شہریوں کی سطح پر آئین کے ساتھ انسلاک کا احساس پیدا نہیں ہوتا۔ آج آپ آئین میں ایک ہزار اچھی چیزیں ڈال دیں، تب بھی پاکستان کے لوگوں کو اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔ صبح کی نشست میں عامر رانا صاحب پوچھ رہے تھے کہ کتنے لوگوں نے آئین پڑھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آئین پڑھنا اور نہ

پڑھنا برابر ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ آئین ہماری زندگیوں سے تعلق نہیں رکھتا۔ اگر تعلق رکھتا ہوتا تو ہمارا اس سے ایک سماجی انسلاک پیدا ہوتا۔ پھر ہم دیکھتے کہ کون اس آئین میں ایک بھی جملے کو تبدیل کرتا ہے۔ ایک مابعد نوآبادیاتی ریاست جس نے لوگوں کو کنٹرول کرنے کے فلسفے پر اپنی عمارت تعمیر کی ہے اور یہ 'اٹھارٹیز منسٹریز' ہے اس مقتدر ریاست میں جمہوری روایات ہو ہی نہیں سکتیں۔ اس کے اندر مکالمے کا کلچر ہو نہیں سکتا۔ صبح ہمارے ایک لیاری کے دوست سوال کر رہے تھے کہ جب تک مختلف گروہوں کے درمیان ہم آہنگی مادی سطح پر نہیں ہوگی تو ان میں یکجہتی پیدا نہیں ہوگی۔ بالکل درست بات ہے، اس لیے کہ وہ ہم آہنگی جو دیرپا ہوتی ہے، وہ سماجی انسلاک سے ہوتی ہے جب ذرائع معیشت میں شراکت داری ہوتی ہے، جب سیاسی حقوق میں شراکت داری ہوتی ہے، تب ہم آہنگی اور ثقافتی امتزاج کا ایک حقیقی وجود سامنے آتا ہے۔

پہلا تو میرا خیال ہے کہ ہماری ریاست کا یہ کردار ہے۔ اس کے نتیجے میں جو دوسری چیز ہوتی ہے جو میں نے پہلی ہی کے ضمن میں گفتگو بھی کی کہ ایک غیر جمہوری رویہ ہر چیز کے اندر ہے۔ ہمارے ہاں کوئی چیز جمہوری طریقے سے حل نہیں کی جاتی۔ جمہوری سلیقے سے حل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اختلافات کو حل کرنے کا کوئی جمہوری نظام ہونا چاہیے۔ جرمنی کے اندر پچاس ہزار معاہدے ہیں، ضلعوں کے درمیان معاہدے ہیں، صوبوں کے درمیان ہوتے ہیں، نئے نئے صوبے بنتے رہتے ہیں، ہمارے ہاں صرف نصیحتوں کے ذریعے سے، اسلام کا استعمال کر کے، اور پاکستان کا، حب الوطنی کا، ایک خدا ایک رسول کا بیانیہ دے کر ہم لوگوں کو چپ کروانا چاہتے ہیں۔ اس طرح کوئی نہیں چپ ہوتا۔ ہم تو ایک گھر کے اندر نہیں چپ ہوتے، بچوں کو چپ کروایا جاتا ہے کہ جو مل گیا ہے اس پر خاموش ہو جاؤ، وہ نہیں مانتا تو آپ اپنے ملک کے ان لوگوں کو کس طرح خاموش کروا سکتے ہیں جو دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے وسائل ہمارے استعمال میں نہیں ہیں یا مکمل طور پر ان سے مستفید نہیں ہو رہے۔

ریاست کا تیسرا اہم کردار مرکزیت ہے۔ اس ریاست کے اندر ہر چیز کو مرکزیت کے سانچے

میں ڈھالا جاتا ہے اور مرکزیت کو ایک اچھی چیز سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں خاص طور پر نظام تعلیم کے حوالے سے آپ یہ سوچیں کہ ایک نقطہ نظر ہے کہ وزارتِ تعلیم صوبوں کے پاس چلی گئی تو ملک کی وحدت ٹوٹ جائے گی، اٹھارہویں ترمیم جب ہوئی اور صوبوں کو تعلیم دی گئی، سب سے پہلے جس نے اٹھارہویں ترمیم میں تعلیم کے صوبوں کے پاس جانے کی مخالفت کی وہ اس وقت کے وزیرِ تعلیم سردار آصف علی احمد صاحب تھے اور اسلام آباد میں اسی طرح کا ایک فورم تھا جہاں پر انہوں نے یہ انکشاف کیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ نظریہ پاکستان کے خلاف ہے، یہ تو قومی وحدت کے خلاف ہے، ہم ایک اور مشرقی پاکستان بنانے جا رہے ہیں۔ ہم نے ان سے سوال کیا کہ جناب جب اٹھارہویں ترمیم بن رہی تھی، ستائیس رکنی کمیٹی کے اندر چار لوگ پیپلز پارٹی کے تھے اور رضا ربانی جو پیپلز پارٹی کے ہیں، وہ چیئرمین تھے اس کمیٹی کو اس وقت تو آپ نے کچھ نہیں کہا۔ اس کے بعد جو کمیٹی کی سفارشات ہیں، یہ کابینہ میں گئی ہوں گی، آپ رکن تھے، آپ نے وہاں بھی مخالفت نہیں کی پھر یہ قومی اسمبلی میں گئی ہوگی پھر یہ سینٹ میں گئی اور جب یہ آئین کا حصہ بن گئیں، اب آپ کہہ رہے ہیں کہ جناب یہ قومی ریاست کے خلاف ہے؟ کہنے لگے کہ یہ میری ذاتی رائے ہے۔ میں نے کہا میں سیاسیات کا طالب علم ہوں، میرا خیال یہ ہے کہ پارلیمانی نظام میں کابینہ کی مشترکہ ذمہ داری ہوتی ہے۔ آپ کابینہ کے اندر بیٹھ کر اختلاف کر سکتے ہیں اور اگر آپ کو شرح صدر حاصل نہیں ہو رہا اور اپنے ساتھیوں سے اتفاق حاصل نہیں کر پا رہے تو آپ استعفیٰ دے دیں۔ لیکن اگر آپ استعفیٰ نہیں دیتے تو کابینہ نے جو بھی فیصلہ دیا ہے، باہر آ کر آپ کو اس کی ذمہ داری لینی چاہیے۔ آپ ایک مہینے کے بعد یہاں بیٹھ کر کہہ رہے ہیں کہ یہ میری ذاتی رائے ہے اور آپ دیکھیے کہ وہ پارٹی چھوڑ کر ایک اور پارٹی میں چلے گئے۔ اب وہاں کھل کر اٹھارہویں ترمیم کی مخالفت کرتے ہیں۔

آپ یہ سوچیے کہ ہماری جو مقتدر اشرافیہ ہے اس میں اِکا دُکا لوگوں کو چھوڑ کے اکثریت کی اپروچ مرکزیت پسندانہ ہے۔ اٹھارہویں ترمیم کے وقت چونکہ قوم پرست گروپ بھی ان کے

ساتھ کمیٹی میں بیٹھے ہوئے تھے، ان کے اصرار کے پر کچھ چیزیں مان لی گئیں۔ مسلم لیگ نواز کے چار ارکان کے نوٹس بھی اس کمیٹی میں موجود ہیں۔ ان نوٹس میں تعلیم کے صوبوں کے اندر جانے کی مخالفت کی گئی تھی۔ چنانچہ آپ دیکھیں کہ جونہی یہ حکومت میں آئے، انہوں نے مرکزی وزارت تعلیم ایک اور نام سے بنالی ہے اور ایک ایک کر کے وہ اختیارات اس کے پاس منتقل ہو رہے ہیں۔ یہ جو مرکزیت کی سوچ ہے، یہ ہمیں ایک قوم بنانے کی راہ میں حائل ہے۔ میرا اپنا خیال یہ ہے اور یہ میں نے سردار آصف کے سامنے بھی رکھا تھا کہ آپ کو یہ خدشہ ہے کہ تعلیم صوبوں میں چلی جائے گی تو ملکی وحدت تباہ ہو جائے گی۔ سوال یہ ہے کہ جب 1971ء میں مشرقی پاکستان بنا اس وقت تو تعلیم مرکز کے پاس تھی، سارے فیصلے مرکز سے ہوتے تھے، پھر بھی قومی وحدت نہیں بن سکی اب صوبوں میں جا رہی ہے تو آپ کو یہ اعتراض ہے کہ یہ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اس وقت کی صورت یہ ہے کہ وزارتِ تعلیم کو صوبوں میں دینے کے باوجود اس وقت جو ٹیکسٹ بک بورڈ ہیں وہ جس نصاب پر کتابیں ڈیزائن کرا رہے ہیں وہ 2007 کا ہے۔ یہ مشرف صاحب کے زمانے میں مرکز میں بنا تھا۔ مجھے چونکہ تین سال سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ کے ڈائریکٹرز میں رہنے کا موقع ملا تو ہم نے وہاں جا کر پوچھا کہ جناب یہ پھر اٹھارہویں ترمیم کا کیا مطلب؟ پتہ یہ چلا کہ کیونکہ 2010 میں یہ ترمیم ہوئی تو کتابیں چھپ چکی تھیں اور اب کتابوں پر نظر ثانی کرنے کا وقت نہیں تھا، تو ہم نے یہ کیا ہے کہ پانچ فیصد تبدیلی کر لی جائے۔ جہاں تک میری معلومات ہیں، میں بورڈ کا ممبر نہیں ہوں، کم از کم سندھ کی حد تک میں مطمئن ہوں کہ بہت مثبت تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ قومی وحدت کا بہت بڑا مسئلہ تھا، سندھ کی تیسری چوتھی جماعت کی کتاب میں یوسفزئی کے پر ایک باب رکھا گیا ہے، ارفع کریم پر ایک باب رکھا گیا ہے، ان میں سے ایک پختون بچی ہے، ایک پنجابی ہے۔ ہم نے بعد میں یہ بات لوگوں کو دکھائی بھی کہ آپ کے خدشات غلط تھے۔ یہ جو ہماری مرکزیت کی ذہنی روش ہے، یہ ہماری تعلیم کے لیے ایک سم قاتل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس پر ہم مزید بات بعد میں کر سکتے ہیں۔

چوتھی جو خصوصیت میں پاکستانی ریاست کی آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں، جس ملک میں معلومات کی جانچ پڑتال کوئی نہیں کرتا، جہاں آپ کے منہ پر لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ آپ کے پاس کاغذ ہو کہ آپ نے اتنی کرپشن کی ہے، آپ کہیں کہ نہیں میں نے تو کرپشن نہیں کی، لیکن یہ ہمارے ہاں نہیں ہوتا۔ آج ریاستیں پوری دنیا میں آزادی اظہار کے پرقدغن لگا رہی ہیں۔ امریکا چھوڑیں، پڑوس میں دیکھیں کیا ہو رہا ہے؟ انڈیا، سیکولر پہچان کا دعویٰ کرنے والا ملک، آج وہاں کیا ہو رہا ہے۔ آپ نے وہ ویڈیو دیکھی ہو گی انہوں نے جو ایک باڈی بلڈر کو مارا ہے۔ میں اخبار کے لیے لکھتا رہا ہوں، اب بھی لکھتا ہوں، میں انہیں کبھی کبھی کہتا ہوں کہ ہم تو کچھ نہیں کر سکتے لیکن تم ہم سے بھی آگے جاؤ گے، روز اتنی نفرتیں جو پھیلا رہے ہو۔ تبدیلی کا ایک مسلسل عمل ہوتا ہے، پھر ستر سال میں نے جو برائی کی اپنے ساتھ، چاہے وہ دین کے نام پہ ہو چاہے کسی بھی نام پہ ہو، آپ کے خیال میں وہ کوئی ایسی تبدیلی تو ہو گی نہیں کہ صفحہ پلٹے گا اور چیزیں ٹھیک ہو جائیں گی۔ رویے تو عمومی طور پر وہی رہیں گے، بات نہ سننے کے، بات نہ سمجھنے کے، چاہتے ہوئے بھی نہ سمجھنے کے۔ اسی لیے میرے بھائی نے ایک بات کی تھی کہ مل کر کام کرنا چاہئے۔ اگر ہم نہیں کرنا چاہتے اور خود کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں پھر نہ سہی۔ آپ کا اپنا ایک نقطہ نظر ہو گا میرا اپنا ہو گا، میں آپ کو کہہ دوں گا کہ آپ نے داڑھی بڑی کیوں رکھی ہے، آپ نے چھوٹی کیوں نہیں رکھی؟ آپ مجھے کہیں گے کہ تم نے تو داڑھی نہیں رکھی ہے یعنی کے چھوٹی چھوٹی باتوں پر سوشل میڈیا پر ان چیزوں نے مزید ہوا پکڑی ہے۔ بعض اوقات ایسی چیزیں علامہ اقبال نے نام سے منسوب کی جاتی ہیں۔ انہوں نے کسی اور کا شعر علامہ اقبال کی تصویر لگا کر چھاپ دیا۔ اب جو آدمی دیکھے گا وہ تو دیکھے گا کہ تصویر لگی ہوئی ہے اور مزیدار شعر ہے تو وہ یہی کہے گا کہ علامہ صاحب کا ہے۔

پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز گزشتہ کئی برسوں سے پاکستان میں امن، ہم آہنگی، رواداری اور استحکام کے لیے منہمک ہے۔اس میدان میں کئی ایک چیلنجز فکری اور نظری سطح پر موجود ہیں جن سے نبرد آزما ہونے کے لیے ادارے نے قومی سطح پر ایک مکالمے کا آغاز کر رکھا ہے۔ جب بات بدامنی اور عدم رواداری کی ہوتی ہے تو یہ ضرورت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ کیسے ملکی اور معاشرتی سطح پر ایک ایسا مقام حاصل کیا جائے جس میں ہم آہنگی بھی ہو اور رواداری بھی۔اسی تناظر میں ادارے نے اس سال پاکستان بھر کی جامعات کے مختلف شعبوں سے وابستہ اساتذہ کے ساتھ تربیتی ورکشاپس اور مکالموں کا اہتمام کیا۔دراصل یہ مکالموں کا ایک سلسلہ تھا جس میں پاکستان کے سربرآوردہ مفکرین نے شرکت کی۔ اس دوران ہونے والی بحث سے کئی نکات سامنے آئے جن سے نہ صرف اس مسئلے سے وابستہ کئی پہلو سامنے آتے ہیں بلکہ ان راہوں کی نشاندہی بھی ہوتی ہے جن پر چل کر اس چیلنج سے نمٹا جا سکتا ہے۔کسی بھی معاشرے کی تشکیلِ نو دنوں یا مہینوں کا کام نہیں بلکہ یہ ایک مسلسل عمل ہے جو سالہا سال جاری رہتا ہے۔تاہم یہ ضروری ہے کہ اس عمل کے لیے ایک راہ متعین کر دی جائے۔مکالموں کا یہ سلسلہ اسی نوع کی جہت نمائی کا ایک قدم ہے۔

ISBN: 978-969-9370-28-1

Price: 100/-